دسمبر ۱۹۶۰ء

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ محصول رجسٹری سال تمام)

ہندوستان پاکستان

دس روپے

قیمت فی کاپی

ہندوستان پاکستان

۷۵ نئے پیسے ۱۲/

یم۔ احمد علی

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں - ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت
مولانا نیاز فتح پوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی تحقیق دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپئے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۶۲ کاغذ دبیز قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

جمالستان ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں) فن انشاء میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے ایڈیٹر نگار کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف حضرت نیاز کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں حضرت نیاز کی انشائے نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (۶/) (علاوہ محصول)

"نگار" کے قدیم خریداران کے لئے خاص رعایت

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۶۰ء میں ختم ہو رہا ہے تو زیادہ مناسب یہی ہے کہ آپ دس روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیج دیں اور ہم سالنامہ ۶۱ء (غالب نمبر) ذریعہ رجسٹری آپ کے نام بھیجدیں۔ لیکن یہ رقم ۲۵ دسمبر ۶۰ء تک مل جانا ضروری ہے۔

اگر آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے تو پھر سالنامہ کے وی پی کا انتظار کیجئے جو دس روپیہ کا ہوگا اور آپ اسے دس روپیہ پندرہ پیسے دے کر وصول کریں گے۔

رعایت یہ ہے کہ نگار کا سالانہ چندہ دس روپیہ ہے اور مصارف رجسٹری وغیرہ میں ۶۰ پیسے ہم کو علٰحدہ خرچ کرنا پڑتے ہیں، یعنی اس طرح ہم کو دس روپیہ کی جگہ صرف ۹.۴۰ ملیں گے۔ لیکن یہ بار ہم خود برداشت کریں گے اور وی پی صرف دس روپیہ کا روانہ ہوگا ـــــ منی آرڈر میں اپنا نمبر خریداری جو پتہ کی چٹ پر درج رہتا ہے، ضرور لکھدیجئے۔

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۶۰ء میں ختم نہیں ہو رہا تو ۵۰ پیسے ذریعہ منی آرڈر یا ٹکٹ کی صورت میں سالنامہ کی رجسٹری کے لئے ضرور بھیجدیجئے، ورنہ ہم اسے معمولی پوسٹ سے روانہ کریں گے اور ضایع ہو جانے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مفت فراہم نہ کر سکیں گے۔ یہ سالنامہ بہت اہم ہے اس لئے دستبرد کا اندیشہ زیادہ ہے۔

ایجنٹ صاحبان

ازراہ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیں کہ انھیں غالب نمبر کی کتنی کاپیاں درکار ہوں گی، ورنہ بعد کو ہم ان کے مزید آرڈر کی تعمیل نہ کر سکیں گے۔ اس سالنامہ کو زیادہ تعداد میں اسٹاک کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ کچھ دنوں کے بعد اس کی قیمت بھی دوچند ہو جائے گی جس طرح اور خاص نمبروں کی ہو گئی ہے۔

منیجر

پاکستان کے خریدار

اگر ان کا چندہ دسمبر ۶۰ء میں ختم ہو رہا ہے تو اپنا سالانہ چندہ دس روپیہ آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیج کر رسید ڈاک خانہ ۲۵ دسمبر ۶۰ء تک ہمارے پاس ضرور بھیجدیں، تاکہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے اور انھیں بروقت مل جائے۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ کراچی

جن کا چندہ دسمبر میں ختم نہیں ہو رہا، انھیں سالنامہ معمولی پوسٹ سے روانہ ہوگا اگر انھوں نے ۸ رجسٹری کیلئے جمع نہیں کرائے اور ہم اسکے تلف ہونے کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

آئندہ سالنامہ ۱۹۶۱ء

"غالب" نمبر ہوگا

لیکن بالکل نئے زاویہ سے، بالکل نئے رُخ سے

غالب پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتابیں، بھی شایع ہوئی ہیں، تنقیدی مقالے بھی لکھے گئے ہیں، رسایل و جراید نے خصوصی نمبر بھی شائع کئے ہیں، لیکن ان سب میں زیادہ تر دو باتوں کو پیش کیا گیا ہے، ایک اس کے سوانح حیات اور دوسرے اس کی اُردو شاعری کا فلسفیانہ و متصوفانہ پہلو۔ حالانکہ صحیح غالب نام ہے اس کے سوانح کا ہے اور نہ اس کی حکمیاتی شاعری کا۔ بلکہ وہ سانس لیتا ہے دراصل اپنے اس کلام میں جس کا تعلق صرف شوخی، بیباکی، طنز و ظرافت اور جرأت رندانہ سے ہے۔

اس کا "احساسِ خودی" اس کی "بیباکی" اس کا "آہنگ خود پرستی" اس کے "طنزیہ اشارے" اس کے "ظریفانہ کنائے" اس کی "حریفانہ چوٹیں" اور سب سے زیادہ اس کا "رندانہ لب و لہجہ"۔ یہ ہیں غالب کی وہ خصوصیات جن کو وہ اپنی زبان میں

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

کہتا ہے اور "نگار" کا "غالب" نمبر۔ غالب کے اسی مصرع کی تفسیر ہوگا۔

اس نمبر میں آپ کو یقیناً یہ تو کچھ نہ ملے گا کہ غالب کا خاندان کیا تھا، وہ کہاں پیدا ہوا، دہلی میں اس پر کیا کیا گزری، وہ کہاں کہاں گیا، کن کن تلخ تجربات سے اسے واسطہ پڑا۔ یہ گورکنی بہت کچھ ہو چکی ہے۔

اس نمبر میں آپ کو "زندہ غالب" ملے گا "پرافگندہ نقاب"۔ عریاں، بیباک اور کسی سے نہ ڈرنے والا ایک ایسا شاعر جس کی دوسری مثال اُردو، فارسی میں کہیں نظر نہیں آتی۔

یہ نمبر "اُردو غالب" اور "فارسی غالب" دونوں کا امتزاج ہوگا

اس التزام کے ساتھ کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ اس میں غالب کے فارسی اور اُردو کلام کا ایسا جنچا تلا انتخاب بھی درج ہوگا جو آپ کو اس کے اُردو و فارسی دواوین کی طرف سے بے نیاز کر دے گا۔

غالباً اس میں غالب کی وہ آخری تصویر بھی ہوگی جو موت کے چند دن پہلے علائی کے اصرار پر کھینچی گئی تھی۔

منیجر

جن کا چندہ دسمبر ۶۰ء میں ختم ہو رہا ہے ان کے نام سالنامہ ۶۱ء دس روپیہ میں ذریعہ وی پی روانہ ہوگا

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے

نگار

اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

۳۹ واں سال	فہرست مضامین دسمبر ۶۰ء	شمارہ ۱۲

ملاحظات ۳
ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر... سید خلیل اللہ حسینی - ۶
منور اور مذہب ..... راج نرائن راز ۱۲
آیندہ جنگ اور طلسم ہوشربا ... نیاز فتحپوری ۱۷
ذوق بن ذوق ..... محمد انصار اللہ نظر ۲۰
باب الاستفسار ..... نیاز فتحپوری ۲۴
باب المراسلہ والمناظرہ ..... // ۲۸
قتل شیر افگن اور معاشقۂ جہانگیر و نورجہاں - ز - زبیری ... ۳۵
نیاز کو بوجہل و بولہب کہنے والوں سے (نظم) - گوہر ۳۹
فلسفی یا پاگل ... مجتبیٰ حسین ۴۱
شذرات ..... نیاز فتحپوری ۴۵
منظومات ..... فانی - جائسی - جگر بریلوی
گوہر - مہو چھاؤنی - شفا گوالیاری
اکرم دھولیوی - سعادت نظیر ۵۱

ملاحظات

بھڑوں کا چھتہ اور ٹائم بم یہ ہیں وہ دو اصطلاحیں جو مسئلۂ کشمیر کے متعلق پنڈت نہرو اور جنرل ایوب خاں نے حال ہی میں استعمال کی ہیں۔ مفہوم و مدعا دونوں کا ظاہر ہے، لیکن چونکہ ان فقروں کا استعمال اُس گفتگو کے بعد ہوا ہے جو پچھلے دنوں بہت خوشگوار و امید افزا فضا میں ہوئی تھی اس لئے لوگوں نے ان الفاظ کو تعجب کے ساتھ سُنا اور افسوس کے ساتھ بھی۔

پنڈت نہرو غالباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ پاکستانی نقطۂ نظر سے اب مسئلۂ کشمیر پر گفتگو کرنا ایسی گتھیوں کو سلجھانا ہے جو سلجھانے کی کوشش میں اور زیادہ اُلجھ جائیں گی اور اس صورت میں زیادہ مناسب یہی ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ برخلاف اسکے جنرل ایوب خاں کا خیال یہ ہے کہ اس کشمکش کا اِدھر یا اُدھر جلد فیصلہ ہوجانا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک ایسا بم ہے کہ اگر اسے راستہ سے ہٹایا نہ گیا تو کسی وقت اس کا پھٹ جانا یقینی ہے۔

دونوں باتیں بالکل ایک دوسرے سے متضاد ہیں، یعنی ایک یہ کہتا ہے کہ مصالحت و مفاہمت کی صورت صرف یہ ہے کہ کشمیر کی موجودہ حد بندی و تقسیم کو بحال رکھا جائے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو اسکے تار و پود کا جائزہ

لیا جائے۔

پاکستان کہتا ہے کہ حسب قرار داد اس کا فیصلہ کشمیر کی رائے عامہ پر ہونا چاہئے، ہندوستان کہتا ہے کہ اب اسکی ضرورت نہیں کیونکہ کشمیر کی موجودہ حکومت کی اسمبلی کا انتخاب ہی رائے عامہ سے ہوا ہے ۔۔ اس میں شک نہیں یہ بڑا نازک قانونی سوال ہے، جس سے ہم کو بحث نہیں، لیکن ہمارا جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ دونوں ملکوں کے مستقبل اور عالمی امن وسکون کے پیشِ نظر اسکا فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے ۔۔ لیکن ہو کیونکر ؟

کسی نزاعی مسئلہ میں (لڑائی کو چھوڑ کر) فیصلہ کی دو ہی صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک یہ کہ دونوں فریق ایثار قربانی کے لئے آمادہ ہو جائیں اور بقالوں کی طرح یہ نہ دیکھیں کہ ترازو کے دونوں پلے برابر ہیں یا نہیں یا پھر یہ کہ کسی تیسرے کو حَکَم بنا کر فیصلہ اس کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔

کشمیر کے مسئلہ میں سب سے پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ خود باہمی مفاہمت کی راہیں نکالنے کی جگہ معاملہ کو مجلس اقوام کے سپرد کر دیا اور مطلقاً اس پر غور نہیں کیا گیا کہ جس جماعت کو حَکَم بنایا گیا ہے اس کی پچھلی روایات اس باب میں کیا ہیں اور وہ اُس دلال کی طرح جو سب سے پہلے اپنا فایدہ سوچتا ہے کبھی کسی ایسے سودے کو پسند نہیں کر سکتی جو اس کے مفاد کے خلاف ہو۔

وہ بخوبی واقف ہے کہ اگر آج ہندوستان و پاکستان ایک ہو کر کسی متحدہ بیرونی پالیسی پر متفق ہو جائیں تو سارے ایشیاء بلکہ ساری دُنیا کا اس سے متاثر ہونا ناگزیر ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ اتحاد کسی وقت سرزمین ایشیاء کو روسی اشتراکیت کے خلاف محاذ بنانے میں سنگِ راہ ثابت ہو۔ اگر مجلس اقوام واقعی کوئی مخلص جماعت ہوتی تو کوریا اور کشمیر دونوں مسئلے کبھی کے طے ہو چکے ہوتے لیکن اس کا مقصد ہی یہ نہیں ہے کہ پاکستان و ہندوستان دونوں متحد ہو جائیں اور اسی لئے اس نے اپنا ایک دامن پاکستان کے ہاتھ میں دیدیا ہے اور دوسرا ہندوستان کے ہاتھ میں تاکہ دونوں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مطالبات پر اڑے رہیں اور ملک کی دولت فوجی طیاریوں پر تباہ کر کے ہمیشہ دوسرے ملکوں کے دست نگر رہیں۔

بہر حال اس باب میں انجمن اقوام سے کسی خیر کی امید رکھنا سخت حماقت ہے اور چارۂ کار اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان و پاکستان دونوں باہم مل کر کوئی راہ صلح و آشتی کی نکالیں ۔۔ لیکن یہ راہ کیا ہو سکتی ہے ؟ ۔۔۔ اس پر مثبت و منفی دونوں پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مثبت پہلو یہ کہ اگر ذہنی حیثیت سے دونوں ملک ایک دوسرے کے دوست و حلیف ہو گئے تو وہ کیا کیا فوائد حاصل کر سکیں گے

منفی پہلو یہ کہ اگر باہمی مخالفت دور نہ ہوئی تو کیا کیا نقصانات سامنے ہیں اور کب تک انھیں برداشت کیا جائے گا۔

یہ دونوں باتیں ایسی نہیں جن کی صراحت ضروری ہو۔ پاکستان و ہندوستان کا ہر فرد بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ موجودہ دورِ تذبذب نے انھیں کتنا گرانبار کر رکھا ہے اور اگر یہ ذہنیت بدل جائے تو صرف کتنی اقتصادی ترقی کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بات دونوں فریقوں کے سوچنے کی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو خصوصیت کے ساتھ اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے، نہ اس لحاظ سے کہ ہندوستان بہ نسبت اس کے زیادہ عرصہ تک نقصانات برداشت کر سکتا ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ پاکستان اپنے آپ کو فریقِ محروم سمجھتا ہے اور سب سے پہلے اسی کو سوچنا ہے کہ اگر کشمیر میں عام رائے شماری کے مطالبہ کو ہندوستان نے تسلیم نہ کیا تو وہ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس صورت میں وہ فوجی قوت سے کام لے کر ہندوستان سے اپنا مطالبہ پورا کرانے کی کوشش کرے گا اور فاتحانہ کشمیر پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا منطقی نتیجہ اس قضیہ کا ہو ہی نہیں سکتا ۔۔ اور ۔۔ اسی کو جنرل ایوب خاں نے ٹائم کے فقرہ سے ظاہر کیا ہے۔

پھر غور کیجئے کہ اگر کسی وقت پاکستان نے فوجی اقدام طے کر لیا (ہندوستان کی طرف سے کسی ایسی پیشقدمی کا امکان نہیں کیونکہ

پاکستان نقطۂ نظر سے بھارت ایک غاصب قابض کی حیثیت رکھتا ہے) تو کیا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہندوستان خاموش نہ بیٹھا رہے گا۔ اور ٹھیک اسی وقت جب پاکستانی افواج نے سرزمین کشمیر کی طرف قدم رکھا، ہندوستانی فوجیں پنجاب و راجپوتانہ کی سمت سے حدودِ پاکستان کی طرف بڑھیں گی اور اسی کے ساتھ بحری و فضائی فوجیں حرکت میں آجائیں گی تمام ساحلی مقامات، فوجی اڈوں، صنعتی شہروں پر بمباری شروع ہو جائے گی۔ اور اگر اس جنگ نے عالمی جنگ کی صورت اختیار نہ کی (جو مستبعد نہیں) اور دونوں ملک خاک سیاہ ہونے سے بچے بھی رہے (جس کا بہت کم امکان ہے) تو کم از کم خطۂ کشمیر تو یقیناً ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ کسی تیسرے کے ہاتھ میں پہونچ جائے۔

جنرل ایوب خاں یقیناً ہم سے زیادہ صحیح تصور ان تمام تباہکاریوں کا کر سکتے ہیں اور وہ یقیناً یہی چاہتے ہیں کہ تمام معاملات صلح و آشتی سے طے پا جائیں، لیکن افسوس ہے کہ حکومت پاکستان نام صرف جنرل ایوب خاں کا نہیں بلکہ وہاں کی رائے عامہ کا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے "علیٰ حالہٖ" کے نظریہ کو سامنے رکھ کر ہندوستان سے فیصلہ کرنا چاہا تو ممکن ہے موجودہ حکومت خطرہ میں پڑ جائے اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے جو اس مسئلہ میں تیغ و تفنگ سے کام لینے پر اُتر آئے، اور اس طرح جس ملک کو انھوں نے اپنے حسن تدبیر سے اتنا اُبھارا ہے وہ پھر گڈھے میں ڈھکیل دیا جائے ـــــ غالباً یہی وہ مجبوری تھی جس کی بنا پر انھوں نے پاکستان کی رائے عامہ کو (جو ممکن ہے وہاں کے حزب عسکری کی بھی ہو) مطمئن کرنے کے لئے اپنی تقریر میں ٹائم بم کا ذکر کر دیا، ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ صحیح طریق کار یہ نہیں ہے۔

یہی دشواری کم و بیش ہندوستان کے سامنے بھی ہے کیونکہ اگر آج وہ کشمیر میں رائے شماری کے اُصول کو منظور کرلے تو تمام ملک میں ایک شور مچ جائے اور کانگریس حکومت متزلزل ہو جائے۔

جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں، یہ مسئلہ بہ نسبت ہندوستان کے پاکستان کے لئے زیادہ اضطراب انگیز ہے، اور اسی کو جنگ سے ہٹ کر کوئی نہ کوئی راہ نکالنا ہے ـــــ اور وہ راہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے عوام پاکستان کو عسکری اقدامات کے ناقابل تلافی نقصانات اور خطرناک نتائج سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے اور جب یہ حقیقت پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اس وقت مسئلہ کشمیر پر گفتگو کی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ جنرل ایوب خاں جو نہایت خلوص و صداقت سے پاکستان کی سربراہی کر رہے ہیں اور جن کی قیادت میں پاکستان ماضی کی گندہ روایات سے ہٹ کر اس وقت تک کافی ترقی کر چکا ہے کبھی اس کو گوارا نہ کریں گے کہ کسی جماعت کے جذباتی اصرار پر کوئی نامناسب قدم اُٹھا کر سارے ملک کو نقصان پہونچائیں۔

ہمیں امید ہے کہ وہ ملک میں ان تلخ حقایق کا احساس پیدا کرنے کی پوری کوشش کریں گے، جو دیر طلب ضرور ہے لیکن نتیجہ خیز بھی ہے۔

پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے اور عہدِ نبوی و خلافت راشدہ کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اسی وقت تلوار اٹھائی ہے جب کسی دوسری قوم نے ان پر حملہ کیا اور ہمیشہ اس ارشاد خداوندی کو سامنے رکھا۔

"قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدون"

(انھیں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور اس حد سے آگے نہ بڑھو۔ خدا حد سے بڑھ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

ہندوستانی مُسلم سیاست پر ایک نظر

(ڈاکٹر اشرف کے مقالے کا جواب)

(سید خلیل اللہ حسینی - ایم - اے - ال ال - بی - حیدر آباد)

مسلمانانِ ہندوستان کے بارے میں ڈاکٹر محمد اشرف نے کمیونسٹ پارٹی کا جو نقطۂ نظر واضح کیا ہے، وہ اکثر مقامات پر قابل اعتراض ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک طویل سیاسی دور کے پیچیدہ مسایل پر تبصرہ کا انداز اکثر مقامات پر سطحی ہوگیا ہے، دوسرے یہ کہ تاریخی حالات کا تجزیہ بندھے ٹکے مارکسی اصول پر کیا گیا ہے جو صحیح نہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آج تک ہندوستانی مسلمان کے ذہن کو نہیں سمجھ سکی۔ حیرت ہے کہ ہندوستان کی مسلم تاریخ میں ڈاکٹر اشرف کو ہر جگہ یا تو سرمایہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یا پھر "سیاسی یتیموں" کی رہنمائی، جو یا تو مسلم سماج کے "بڑھاپے کی اولاد" تھے یا انگریزوں کے آلۂ کار۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اُن بہت سے عوامل و عناصر کو نظر انداز کر دیا جن کا اِن تاریخی حالات کی تشکیل میں بڑا ہاتھ تھا۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ دراصل کافرانہ اقتدار کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ تھا، جس میں مذہب نے اہم حصہ لیا اور اس جذبہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محترم مضمون نگار جب یہ دیکھتے ہیں کہ مسلم عوام نے ایسے نوابوں اور بادشاہوں کی بحالی کے لئے کوشش کی جن کی وفاداریاں مشتبہ تھیں، تو ان کو حیرت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اشرف کا نشانۂ ملامت علی گڑھ بھی ہے جس کو وہ انگریز کی سیہ کاریوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، گو ساتھ ہی وہ سرسید کی بیدار مغزی سے متاثر ہو کر اُن کو انگریزوں کے پٹھوؤں کی صف سے نکال لیتے ہیں۔ تضاد بیان کا یہ دلچسپ نمونہ قابلِ غور ہے۔ علی گڑھ سرسید کی حیات کا حاصل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے جن لوگوں سے کام لیا ہو اُن میں انگریزوں کے یارانِ وفادار بھی شامل رہے ہوں، لیکن یہ واقعہ اس حقیقت کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ علیگڑھ کی یہ تحریک حاکم اور وفادار مسلمانوں کے غلامانہ تعلقات کا قابلِ نفرت نمونہ ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف آخر کے حالات کو سمجھنے کے لئے ہم بیسویں صدی کے نصف آخر کے پیمانے استعمال کرتے ہیں۔ آج ہم آزاد ہیں۔ لیکن اُس وقت جبکہ انگریزی اقتدار نے اپنی ہیبت و تسلط کا سکہ جما لیا تھا، حالات سے مطابقت پیدا کرنے اور نشاۃ الثانیہ کی راہیں نکالنے کے واسطے یہ ضروری تھا کہ حکومت کے اقتدار کو چیلنج نہ کیا جائے اور اقتضاءِ وقت کو اُسی طرح تسلیم کیا جائے جس طرح ہند کے دستور پر سخت سے سخت تنقید کرنے والے کمیونسٹ رہنما کیرالا میں دستور کی پابندی کا حلف لینے پر مجبور ہوئے، مگر یہ شاید عملی مصلحت ہے اور وہ غلامانہ ذہنیت تھی!

لایق مضمون نگار کا یہ انکشاف بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ شبلی، حالی اور اقبال کی شاعری "افیون" کا نشہ رکھتی ہے جس سے "حرماں نصیبوں کو یک گونہ بیخودی اور امراء کو ایک روحانی تسکین حاصل ہو جاتی تھی"! چونکہ اُن حضرات کی شاعری میں مذہب کا اثر تھا اس لئے مارکس کی زبان میں انھیں تو افیون کہہ دیا گیا، لیکن اگر ہندوستان کے مزدوروں کے سامنے روس اور چین کے مزدوروں کے عظیم کارنامے گنائے جائیں اور اُن کو آمادۂ انقلاب کیا جائے تو یہ افیون نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ جس شاعر نے :-

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کا نعرہ بلند کیا ہو، آج اُس کے کلام میں افیون نظر آتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے "لینن، خدا کے حضور میں" جیسی نظم لکھی اور یہ اعلان کیا کہ :-

" در مقام لانمی ساید حیات ـــــ سوئے الامی خرامد کائنات "

دُنیا جانتی ہے کہ یورپ کی ہیبت ایشیاء کے دل سے جو کم ہوئی اُس میں بیسویں صدی کے اوایل کا سب سے اہم واقعہ جاپان اور روس کی جنگ ہے، جس میں روسیوں کو شکست ہوئی تھی نہ کہ ۱۹۰۵ء کا وہ روسی مزدور انقلاب جو ناکام ہوگیا۔ اسی طرح یہ تو کہدیا گیا کہ برطانیہ نے اپنی حکمت عملی کی بنیاد پر بنگال تقسیم کیا، لیکن کیا محترم ریسرچ اسکالر اس بات سے واقف نہیں کہ اس مطالبہ کی تائید مسلمانوں نے کی تھی۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ ساری دُنیا کے حالات میں تبدیلی کے رجحان کا آغاز روس کے انقلاب ہی سے کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسا کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ سحر اس لئے ہوئی کہ مُرغ نے بانگ دی۔ ڈاکٹر اشرف نے یہ بھی کہا ہے کہ اہل علم مسلمان انقلابِ روس کی ماہیت سمجھنے میں اس لئے قاصر رہے کہ وہ سامراج کے خلاف اتحاد کے منکر ہیں۔ حالانکہ یہ بھی بالکل خلاف حقیقت ہے اور بیسیوں مسلم اکابر نے سامراج کے خلاف عملی قدم اُٹھا کر قید و بند کی تکالیف برداشت کیں۔

بڑا دلچسپ ریمارک اقبال پر یہ کیا گیا ہے کہ "آفتابِ تازہ" نظم لکھنے والا اقبال سامراج کے خلاف جد وجہد میں گفتار کا غازی بن کر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ حالانکہ مارکس نے بھی پہلے کتاب ہی لکھی تھی اور کسی باغیانہ تحریک کو منظم نہیں کیا تھا؟ ڈاکٹر اقبال نے مسلم ڈومینین کا مطالبہ کیا تھا، اس کی تشہیر انگلستان سے چودھری رحمت علی نے کی۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ پروپیگنڈا برطانوی وزارت کے اشارہ پر ہوا۔ اگر انگلستان میں بیٹھ کر یہ کام کرنا برطانوی اشارہ کا نتیجہ تھا۔ تو مارکس کا انگلستان میں بیٹھ کر سرمایہ " Das Capital " نامی کتاب لکھنا کیا تھا؟ یہ حقیقت ہے کہ عرصہ تک برطانوی سیاست نے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے خیال کو کچلنے کی کوشش کی، انگریزوں کے ذہن میں پان اسلامزم کا خوف تھا، اس لئے وہ ایک نئی مسلم مملکت کے جنم کے تصور ہی سے لرزہ براندام ہوجاتے تھے، اور پھر جنھوں نے طرابلس کا جہادِ آزادی دیکھا تھا، سوڈان کے مہدی سے مقابلہ کیا تھا اور اتاترک سے شکست کھائی تھی، وہ کیسے گوارا کرسکتے تھے کہ ایک اور مسلم مملکت اُن کے دردِ دل میں اضافہ کرے۔ یہ تو بعد کے حالات ہیں کہ اس نئی مملکت کی پالیسی وہ نہیں رہی جس سے ان اندیشوں کی تصدیق ہوتی! مگر اُس وقت کے حالات پر موجودہ حالات کی روشنی میں رائے قایم کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ جہاں تک مسلم عوام کے رجحان کا تعلق ہے انتہائی سامراج دشمن مطالبہ تھا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ گاندھی، اور نہرو جیسے سامراج دشمن لوگ جو اس مطالبہ سے متفق ہوئے ہیں اس کی ایک وجہ یہی تھی۔

مضمون کی تیسری قسط میں سرمایہ دار طبقہ کے حالاتِ پیدائش بیان کئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے اشارہ پر سراکبر کے توسط اور نظام کے سرمایہ سے آصف جاہی سوتی مل اور آغا خان کے توسط سے اندور میں مسلم سوتی مل قایم کی گئی اور اس طرح مسلم بورژوا طبقہ کا جنم عمل میں آیا۔ اگر ڈاکٹر اشرف یہ کہتے کہ چند کارخانوں کے قیام سے کچھ ایسے مسلمان آگے آئے جو بورژوا تھے تو بھی غنیمت تھا ورنہ اتنے وسیع علاقے اور اتنی بڑی آبادی میں، ایک دو کارخانوں کا کھل جانا اگر بورژوا طبقہ کے جنم کی دلیل ہے تو پھر ہم کو طبقہ کی ایک نئی تعریف کرنی پڑے گی اور وہ یہ ہوگی کہ کارخانوں کے ساتھ بورژوا طبقہ وجود میں آجاتا ہے۔

لایق مضمون نگار نے کانگریس کی اُس مسلم رابطہ کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے وہ خود نگراں تھے ، یہ انکشاف کیا

ہے کہ جب نہرو، ہندوستان سے باہر گئے تو ایک دن بلا اطلاع مسلم رابطۂ عوام کا شعبہ بند کر دیا گیا اور موصوف کی تیار کردہ رپورٹ کو سردار پٹیل کے معتمدِ خاص اچاریہ کرپلانی نے شایع کرنا مناسب نہیں سمجھا، اگر ڈاکٹر موصوف وہ رپورٹ جس کو شعبہ مسلم رابطہ عوام کا مرثیہ کہنا مناسب ہوگا، شایع فرما دیتے تو بہتر ہوتا۔ کم ازکم میں تو واقف نہیں ہوں کہ ایسی کوئی چیز شایع ہوئی ہو اگر لینن کی وصیت، اسٹالن کی وفات کے بعد شایع ہوسکتی ہے، اگر مولانا آزاد کی کسی خاص تحریر کی اشاعت ۳۰ سال کے بعد عمل میں آسکتی ہے، تو کیا بُرا ہے کہ ایک طویل مدت کے بعد ہی سہی اب یہ رپورٹ شایع کردی جائے، تاہم لیگ اور کانگریس کے تصادم کو سمجھنے کے لئے خود مولانا آزاد کی حالیہ کتاب بہت کافی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک کے سیاسی رُجحانات کے تغیرات میں برلا اور اصفہانی کا ہاتھ نہ تھا بلکہ خود ارباب وطن کا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے سلسلہ میں ایک بات یہ بتائی گئی ہے کہ آدھے یورپ میں مزدور انقلاب ہوچکا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آدھا یورپ روسی فوج کے جوتوں سے دبا ہوا تھا، بالکل اُسی طرح جس طرح کسی زمانہ میں تاتاریوں نے بہت سی سلطنتوں کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایک صریحًا فاتحانہ چیرہ دستی کو مزدور انقلاب کا نام دینا کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

کانگریس کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا جس عامیانہ انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ تاریخ کو مسخ کرنے کی بڑی عجیب کوشش ہے۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی گئی ہے کہ جناح صاحب کے واحد مشیر خصوصی اصفہانی تھے اور یہ کہ شملہ کانفرنس کے اخراجات اصفہانی صاحب نے برداشت کئے، اگر اس دعویٰ کو مان بھی لیا جائے تو بھی اس میں بُرائی کیا ہے۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے قایدین روس اور مشرقی یورپ کے "آزاد کردہ ممالک" کی یاترا کے لئے جاتے ہیں تو اُن کے اخراجات کیا مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر برداشت کرتے ہیں؟ اور کیا کیرالا میں الیکشن کے موقعہ پر ایک لاکھ سے زائد الاؤنس پانے والے کارکنوں کی امداد کسی دست غیب سے ہوئی تھی؟

مُسلم سیاست کا طبقاتی تجزیہ کرتے ہوئے اِس بات کو ایک مسلمہ حیثیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ "مسلم اور ہندوستانی قومی سیاست کا باہمی اختلاف اور تصادم دراصل ہندوستان کے دو اُبھرے ہوئے متوسط طبقوں کے مفاد کا تصادم ہے"۔ حالانکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ جب مسلمان حملہ آور ہونے کی حیثیت سے یہاں آئے تو اہلِ ہندوستان جو یہاں صاحبِ اقتدار تھے فطری طور پر اپنے اقتدار کے چھن جانے کی بنا، پر نالاں تھے، لیکن عام طور پر مسلم حکمراں اور خاص طور پر مغل شہنشاہوں کی وسیع النظری نے ایسے کسی اختلاف کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیا۔

ڈاکٹر اشرف نے شاہ ولی اللہ پر گہرے طنز سے کام لیا ہے کہ انھوں نے غیر ملکی حکمرانوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے حالات پر غور نہیں کیا۔ جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا اور مرہٹوں کی تاخت وتاراج سے وسطی اور شمالی ہندوستان کے شرفا ہندو اور مسلمان الامان پکارنے لگے تو شاہ ولی اللہ نے یہ محسوس کیا کہ ایسے غارتگروں کی قوت توڑنا اور اُن کے تسلط سے ملک کو نجات دلانا ضروری ہے۔ حیرت ہے ہنگری کے یوناس کاڈر کا روسی فوجوں کی مدد چاہنا، ماؤزے تنگ کا روسی امداد کا طالب ہونا اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کو یہ تمنا کرنا کہ چین کی نجات دہندہ فوجیں آکر ہندوستان کو آزاد کرائیں، یہ سب کچھ جایز ہو لیکن شاہ ولی اللہ کا بیرونی مدد چاہنا ناجایز! عجیب منطق ہے!

تاریخ کی اس حقیقت سے شاید ہی انکار کیا جاسکے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں قدم مضبوط کرنے کے لئے ہندو بنیوں اور برہمنوں سے ساز باز کی تھی اور انہی لوگوں کے توسط سے بنگال اور مدراس میں کچھ بے حمیت مسلمانوں کو بھی ملا لیا تھا ہندوؤں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وہ اس نئی طاقت کے بل بوتے پر ہند کی اجتماعی زندگی میں پاسکیں۔ یہی نقطۂ نظر اس وقت بھی

سامنے تھا جب خالص عربی اقتدار کے خلاف ابو مسلم خراسانی کی رہنمائی میں ایرانیوں نے عباسی تحریک کا ساتھ دیا اور اموی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ پھر معاف فرمائیے کہ چھوٹے پیمانے پر یہی کام ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی بھی متحدہ محاذ کے نام سے کرتی رہتی ہے

یہ صحیح ہے کہ انگریزوں نے یہاں کی فرقہ واریت کو تیز کیا، لیکن وہ کسی غیر موجود چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لائے، اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ یہاں فرقہ واریت تھی جس سے انگریزوں نے فایدہ اُٹھایا، بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج کیرالا کی کمیونسٹ پارٹی بورژوا اور پرولتاریہ جماعتوں کے اختلافات سے فایدہ اُٹھاکر ۱۹۵۷ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلم جاگیری عناصر کی درازی عمر کی وجہ یہ تھی کہ "ہندوستانی متوسط طبقہ کے رہنماؤں اور بالخصوص کانگریسی تحریک نے کبھی جاگیری مفاد کے خلاف صف بندی میں حصہ نہیں لیا" بات صحیح ہے کیونکہ کانگریس نے ایسا کیا نہیں۔ لیگ، بقول ڈاکٹر اشرف جاگیری عناصر پر مشتمل تھی۔ رہی کمیونسٹ پارٹی، سو اس کو "اسٹالین" کی مدح سرائی سے فرصت ملی!

سلسلۂ بیان میں کیرالا کے لیگ اور کانگریس اتحاد پر بھی طنز کیا گیا ہے، لیکن یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ اگر کمیونسٹ پارٹی پونا اور دہلی کے بلدی انتخابات میں جن سنگھ سے ساز باز کر سکتی ہے تو لیگ اور کانگریس کی اس کورٹ شپ پر اُسے اعتراض کیوں ہو۔

مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار کا دردناک انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے اس اندیشہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس "خانۂ خالی" میں کوئی مفسدانہ سیاست یا فراری رجحان اپنی جگہ نہ بنالے۔ سوال یہ ہے کہ بارہ سال کے اس طویل عرصہ میں اس ذہنی خلا کو پُر کرنے کا خیال کمیونسٹ پارٹی کو کیوں نہ آیا؟ جو اب بھی دشوار نہیں، جس پارٹی کی ذمہ داریاں بین الاقوامی قسم کی ہوں اور جس کی آدھی صلاحیت مغربی سامراج پر تبرا کرنے میں اور باقی نصف روس و چین کی مدح سرائی میں صرف ہوتی ہو، اس کے پاس اتنا وقت کہاں کہ پانچ کروڑ بے سہارا مسلمانوں کے زخموں کا اندمال کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو اسلام کی طویل تاریخ میں طبقاتی کشمکش کا صرف ایک واقعہ نظر آیا اور وہ حضرت ابوذر غفاری کا اعلان ہے۔ اس عظیم المرتبت صحابی کا نقطۂ نظر قرآن کریم کے اس اشارہ پر مبنی تھا کہ:-

"یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو" (پوچھتے ہیں تم سے (اے محمدؐ) کہ ہم کیا خرچ (خدا کی راہ میں) کہدو جو ضرورت سے زائد ہو)

اسلام میں زکوٰۃ فرض ہے اور اس سے زاید خرچ کرنا ترغیب و مشورہ ہے۔ گویا یہ اخلاقی حکم ہے قانونی حکم نہیں، ایسی صورت میں مملکت یا امیرالمومنین کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اس بات کو قانون کے روپ میں نافذ کرے اسکے برخلاف حضرت ابوذر غفاری کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس کو قانونی روپ دیا جائے، بعد میں بھی کئی فقیہوں نے خصوصاً علامہ ابن مسکویہ نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اگر مسلم معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ صرف زکوٰۃ کی آمدنی سے غربت دور نہ ہوسکے تو امیر وقت کو اختیار ہے کہ وہ دولتمندوں سے فاضل رقم لے۔ تاآنکہ غربت ختم ہوجائے۔ خود علامہ اقبال نے بھی اس خیال کو پیش کیا ہے:-

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضرب کلیم)

یہ صحیح ہے کہ مغربی ایشیا کی فتوحات نے مسلمانوں کی دولتمندی میں اضافہ کیا اور یہ بھی درست ہے کہ بعض لوگ بہت مالدار ہوگئے، اس میں بھی شبہ نہیں کہ بیت المال حکمراں خاندان کی مرضی کا پابند ہوا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم سماج کی بنیادیں اسلام کے تصورات ہی پر قایم تھیں، اس لئے غربت اور امارت ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ ہوسکیں۔

یہ درست ہے کہ اولی الامر کی تشریح بھی مختلف لوگوں نے مختلف کی ہے لیکن یہ اعتراض کیا اُن لوگوں کو زیب دیتا ہے

جو کمیونزم کو تاویلات کا گورکھ دھندا بنا چکے ہوں۔ ٹٹو کا کمیونزم - لینن کی N.E.P - اسٹالین کی اجتماعی کھیتی - چین کے کمیونس - کروشچیف کی پُرامن ہمہ وجودی اور چین کا نعرہ کہ جنگ ناگزیر ہے، آخر ان سب میں کہاں کی مطابقت ہے ؟

بڑی دلچسپ بات یہ کہی گئی ہے کہ قرآنی حکومت کے دعویدار (مصر اور انڈونیشیا کی) جماعتیں سامراج کا آلۂ کار ہیں - یہ بات تاریخی حقیقت ہے کہ زار کی حملہ آور فوجوں کو ناکام بنانے کے لئے جرمن حکومت نے خاص طور پر لینن کو روس پہونچنے میں مدد دی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مصر کے اخوان المسلمون انگریزوں کے آلۂ کار تھے - یہ واقعہ ہے کہ پورے مغربی ایشیا میں انگریزوں کے اتنے شدید دشمن اب تک پیدا نہیں ہوئے جتنے کہ اخوان المسلمون کے سرفروش رضاکار رہے ہیں۔

اسی طرح انڈونیشیا کی دارالسلام تحریک کو بدنام کرنے کے لئے چاہے کچھ بھی کہا جائے لیکن اُس پر ڈچ دوستی کا الزام عاید نہیں ہوسکتا، برخلاف اس کے انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی بدستور کمیونسٹ چین کے مفادات کی علمبردار بنی ہوئی ہے۔

تاریخ اسلام میں عینیت پرستی کے رجحان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ " احیائے دین کا ایک پہلو اور بھی ہے جو انسانیت کو مومن اور کافر میں تقسیم کرکے نفرت اور عداوت کا بیج بو دیتا ہے"

وہ لوگ جو دنیائے انسانیت کو بورژوا اور پرولتاریہ میں تقسیم کرکے مستقل منافرت پیدا کرنا اپنا تقدس سمجھتے ہیں، اُنکے زبان سے ایسا اعتراض مناسب نہیں۔

مسلم سماج کے عوام کے ساتھ گرے ہوئے برتاؤ کو ثابت کرنے کے لئے اس سماج میں مروجہ چند کہاوتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ عوام جانور ہوتے ہیں (کالانعام) کہاوتیں سماجی فکر سمجھنے میں مدد ضرور کرتی ہیں لیکن کوئی ایک کہاوت کسی قطعی نقطۂ نظر پر نہیں پہونچا سکتی۔ مسلمانوں میں نوکر کو آدمی کہا جاتا ہے۔ خاکروب کو مہتر۔ تو کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ سماج میں ملازمین اور خاکروبوں کا مرتبہ بہت بلند ہے ؟ قطع نظر اس کے کہ مسلمانوں نے عوام کو جانور سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن کمیونسٹ پارٹی نے ساری دنیا میں عوام ہی سے جو استحصال کیا ہے اس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اسٹالین جسے کل تک خدا بنایا جاتا تھا، اُس کے کارنامے کروشچیف کی زبان سے سننے کے قابل ہیں، اسی طرح برلن اور ہنگری میں جو کچھ کہا گیا اور چین میں سامراجی ایجنٹ ہونے کے الزام پر لاکھوں انسانوں کو جو موت کے گھاٹ اُتارا گیا اس سے کون واقف نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شریف اور رذیل، نیز عوام اور کم اصل کی اصطلاحیں مروج رہی ہیں، لیکن مسلمانوں میں فیصلہ کن چیز انسان کا اپنا کردار ہوا کرتا تھا۔ ورنہ غلاموں کے کارنامے تاریخ اسلام کا اتنا روشن باب نہ ہوتے، ڈاکٹر اشرف کو یہ تو نظر آیا کہ مسلم معاشرہ میں شریف اور رذیل کا امتیاز رہا ہے، لیکن انھوں نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کتنے انسانوں کو اسی مسلم معاشرے نے پستی سے اُٹھایا ہے اور کتنے غلاموں کو آزاد کرکے بلند مرتبہ تک پہونچایا۔

یہ صحیح ہے کہ امتیازی رجحانات ہندوستان میں کسی قدر زیادہ ملتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلام اور مسلم معاشرہ کسی طبقاتی کشمکش کا شکار تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مقامی حالات اور رجحانات کا، کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ اسٹالین جابر بننے پر مجبور تھا کیونکہ ملک کے عوام زار استبداد کے عادی ہو چکے تھے۔

جس فرائضی تحریک کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ زمین اُس کی ہے جو کاشت کرتا ہے وہ عین تعلیمات اسلامی کے مطابق ہے، ڈاکٹر موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر تین سال تک کوئی شخص اپنی زمین پر زراعت نہ کرے تو اس کو بہ حق حکومت ضبط کرلیا جائے۔

روس کے مزدوروں کی ترقی کا جو شاعرانہ ذکر کیا گیا ہے اس پر ہنسی آتی ہے، اگر روس کی شاندار ترقی کا اشارہ کسی

سیارہ کو فضا میں بھیجنے کی طرف ہے تو عرض یہ ہے کہ یہ نہ روسیوں کا کارنامہ ہے نہ امریکیوں کا، یہ صرف اُن جرمن سائنسدانوں کا صدقہ ہے جنھیں برلن سے پکڑ لیجایا گیا اور دوسرے درجہ کے سائنسداں امریکہ کے ہاتھ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ روس نے اسٹینک چھوڑنے میں سبقت حاصل کی۔

ڈاکٹر اشرف فرماتے ہیں کہ سامراجیوں نے روسی انقلاب کی حقیقت کو ہماری نظروں سے چھپایا اور مظالم کے افسانے گھڑے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سامراجیوں نے افسانے لکھے تھے تو اس کا دیباچہ کردشچیف نے کیوں لکھا؟

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ مسلم ذہن پر اب بھی جاگیری اور قرآنی سیاست کا اثر پایا جاتا ہے، دوسری طرف اس خوش فہمی کا اعلان کہ "تقریباً ہر بیدار ذہن اگر کمیونسٹ پارٹی میں شریک نہیں تو اس سے قریب ضرور ہے"۔ اور اس سلسلہ میں چند ترقی پسند لوگوں کے نام دئے گئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ اگر ہر بیدار ذہن مسلمان کمیونسٹ پارٹی سے قریب ہے تو پھر یہ مسلم عوام سے رابطہ کی کوشش کیوں ہو رہی ہے؟

آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ "لکم دینکم ولی دین" کا "اصول ہمارا پختہ عقیدہ اور مستحکم پالیسی ہے"۔ کاش ایسا ہوتا، کیرالا میں جو نصابی کتابیں لکھائی گئیں تھیں کیا واقعی اس میں یہ غیر جانبداری قایم تھی؟ وہ کتابچہ ابھی ہمارے ہاں محفوظ ہے جو "المسلمون فی الصین" (چین میں مسلمان) کے نام سے حکومت چین نے مسلم ممالک میں گشت کرایا تھا۔ آپ اتنا ہی بتادیں کہ اس میں جن مسلم علماء کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اب کتنے موجود ہیں؟ سنکیانگ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوا؟۔ قازقستان میں مسلمانوں کی اکثریت کم کرنے کے لئے کتنے روسیوں کو آباد کیا گیا؟ روس کے وہ ریڈیو اسٹیشن جو نام نہاد روسی مسلم جمہوریتوں کے لئے پروگرام نشر کرتے ہیں اپنے پروگرام کا کتنا حصہ اسلام کے خلاف پروپگنڈا میں صرف کرتے ہیں؟۔ قازقستان کے مسلمانوں کے لئے یکم مارچ ۱۹۵۳ء سے یکم جولائی ۱۹۵۷ء تک جو ۲۶ کتابیں شائع کی گئی ہیں اور جن میں اسلام کے خلاف شدید پروپیگنڈا کیا گیا ہے، ان کی تعداد اشاعت (۳) تین لاکھ گیارہ ہزار تھی حالانکہ قازقستان کی کل آبادی ۳۰ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ گویا اوسطاً ہر دس آدمی کے لئے ایک مذہب دشمن کتاب شایع ہوئی ہے۔ ان میں سے ۲۴ قازق زبان میں ہیں، ایک روسی زبان میں اور ایک شنستان زبان میں ایسے ملک میں جہاں پریس، پلیٹ فارم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پوری طرح حکومت کے ہیں ہو، جہاں کوئی شخص نہ اخبار نکال سکتا ہو اور نہ کتاب شایع کرسکتا ہو، جہاں بورس یا سٹرناک کو بھی اپنی کتاب اٹلی سے شایع کرنی پڑی ہو۔ وہاں "لکم دینکم ولی دین" کا اعلان کرنا حیرت کی بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پارٹی کو یہ مشورہ دیا ہے کہ "کمیونسٹوں کو چاہئے کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو اطمینان دلادیں کہ ہم انفرادی اور جماعتی دونوں حیثیتوں سے اُن کے جایز حقوق اور آزادی کے پاسبان ہیں"۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ مشورہ بہت بعد از وقت ہے اور اس سلسلہ میں ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ:-

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ!

عورت و اسلام

جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے کی مشہور تصنیف، جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کس قدر بلند کردیا ہے۔

قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

منوّر اور مذہب

(راج نرائن رازؔ)

منشی بشیشور پرشاد منوّر، ناظم بھی ہیں اور غزل گو بھی، اور بعض منظومات پر اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کے دائرہ میں بھی آجاتی ہیں۔

منوّر کی مذہبی شاعری میں جذباتی عقیدت تو ہونا ہی چاہئے، لیکن اس کی عقیدت سطحی تفریقات کے پردوں میں گہرائی کو بھی ڈھونڈھ لیتی ہے اور مادی پہلو کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

منوّر کا مذہب انسانیت ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ منوّر نے انسانیت ہی کو پالینے کے لئے مذہب کا راستہ اختیار کیا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

مذہب اور سائنس کی جنگ مسلم ہے لیکن منوّر نے ان دونوں کو متضاد نہیں سمجھا۔ عظمتِ انسان کا اسے بڑا پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اس کے تیور بڑے تیکھے ہوجاتے ہیں۔ انسان کی ترقی کو دیکھ کر جب جبین قضا و قدر پر بل پڑتے ہیں تو وہ سراپا سوال بن جاتا ہے۔ انسان کی قوت اور برتری کا احساس اسے اس درجہ ہے کہ وہ کرم کی بھی ایک خاص حد مقرر کر دیتا ہے ؎

یہ بل جبین قضا و قدر پہ کیوں آخر — بنا رہے ہیں مقدر جو آج ہم اپنا
کو یم ہم کہیں بے دست و پا نہ ہوجائیں — بس ایک حد مقرر میں رکھ کرم اپنا

منوّر نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی، جہاں رام بھگتی کا چرچا ہر وقت رہتا تھا۔ وہ دیو مندروں کا پجاری ہے۔ اس کے عقاید کی پشت پر اس کے خاندان کی سناتن[1] دھرمی چھاپ موجود ہے۔

منوّر کا مسلک کیا ہے؟

منوّر کا رشتہ ہندو مت سے، تعلق اسلام و عیسائیت سے اور لگاؤ بدھ مت، جین مت، سکھ مت اور تھیا صوفی سے ہے لیکن منوّر کی عقیدت اس کے جذبات کی آفاقیت کو کسی طرح مجروح نہیں کرتی۔

لگائیں گے اس کو چشم و سر سے جو شے ہمیں کام کی ملے گی

سچ تو یہ ہے کہ منوّر کا یہ مسلک انیسویں صدی کی متعدد مذہبی تحریکوں سے متاثر ہے، یہ تحریکیں گو بظاہر مذہبی تھیں لیکن ان کی نوعیت سماجی و سیاسی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ مذہب کو روز کی زندگی میں جس درجہ دخل ہندوستان میں ہے وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ انیسویں صدی کی مذہبی تحریکیں اتنی وسیع تھیں کہ ہندوستانی زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو ان سے متاثر نہ ہوا ہو۔ قومیت کا جذبہ ابتدائی مراحل میں انھیں تحریکوں کے سائے میں پروان چڑھا۔ بعض اہم اصلاحات بھی انھیں کے اثر سے عمل میں آئیں۔ چھوت چھات، ستی اور بچپن کی شادی کے خلاف مہمات شروع ہوئیں۔ منوّر نے چھوت چھات

---

[1] علامہ بشیشور پرشاد منوّر۔ خود نوشت سوانح عمری۔ مطبوعہ پاسبان چندی گڑھ۔ بابت مئی ۱۹۵۹ء۔ ص ۲۴

کے خلاف جذبہ انھیں سے اور بعد کی مذہبی تحریکوں سے پایا ہے۔ ان کے ہاں حب الوطنی کا جو آہنگ ہے وہ بھی انھیں تاثرات کا نتیجہ ہے، لیکن یہاں بحث منوّر کی صرف مذہبی نظموں سے ہے۔

منوّر کے مسلک کی عکاسی جس طرح اس کی مذہبی نظموں میں پائی جاتی ہے اسی طرح اس کے لطیف اشارے ان کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں:-

خواہ کعبہ میں رہوں خواہ میں بتخانے میں ـــــ فرق آئے گا منور مرے ایماں میں نہیں

کام کی شے ہے نہ کعبے کی نہ بتخانے کی خاک ـــــ عشق کے مذہب میں ہے مسجود پروانے کی خاک

ملتیں یوں نہ اُڑاتیں کبھی ایماں کا مذاق ـــــ دیر و کعبہ کی کلیسا کی ضرورت کیا تھی

ہم اپنے دل کو مقامِ خدا سمجھتے ہیں ـــــ یہی ہے دیر اب اپنا، یہی حرم اپنا

نہ بتوں پر نہ خدا ہی پہ نظر ہے اپنی ـــــ عہد تکمیلِ وفا ہی پہ نظر ہے اپنی

تفرقہ ڈالنے والوں سے بہت دور ہوں میں ـــــ واسطہ تم سے پھرائے دیر و حرم کیا رکھوں

رواداری ہماری تہذیب کا خاصہ ہے۔ ہندوستان نے اسی سے اپنی ثقافتی زندگی سنواری اور اسی لئے اگر یہی کیفیت ہندوستانیوں کے مزاج میں رچی بسی ہو تو تعجب کی بات نہیں۔

ع دوست سے کوتھی دوستی غیر سے دشمنی نہ تھی

ممکن ہے منوّر نے اپنے نظریہ کا جو یہ تجزیہ کیا ہے وہ صحیح ہو لیکن جہاں تک مذہبی منظومات کا تعلق ہے ان میں غیر کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ منوّر کی نظمیں اس کی وسیع المشربی کا بین ثبوت ہیں۔ کام کی شے کو آنکھوں سے لگانے میں اُس سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی۔ اس نے دُنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے صحیفوں (قرآنِ کریم، انجیل مقدس، دھمپد، گرو گرنتھ صاحب سکھ منی صاحب اور یوگ سار) سے روشنی لی ہے۔

منوّر کا مذہب محبت کا مذہب ہے۔ انسانیت عبارت ہے ہمدردی اور محبت سے اور یہی انسانیت اس کی نگاہ میں حضرت مسیح کی تنہا حقیقت تھی، اس لئے جب شاعر کا مسلک محض انسانیت پرستی ہو، تو اس کی عیسائی مت کے پیغمبر سے عقیدت رکھنا تعجب کی بات نہیں۔ حضرت مسیح سے منوّر کی عقیدت خدا پرستی کی وہ صورت ہے جو "ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست" کے مصداق ہے۔

عدم تشدد کے جس راستے کو ہندوستان نے اختیار کیا اور جسے آج دُنیا عالمی امن کا تنہا وسیلہ سمجھے ہوئے ہے، حقیقت میں بدھ مت کی دین ہے۔ پُر امن بقائے باہم کا منبع بھی عدم تشدد کا یہی جذبہ ہے اور اس کے لئے دُنیا مہاتما بدھ کی ممنون ہے۔ منوّر، بدھ مت سے شاید اتنا متاثر نہیں جتنا مہاتما بدھ سے۔ اس نے مہاتما بدھ پر متعدد نظمیں کہی ہیں۔ مہاتما بدھ کے فرمودات دھمپد کو اُردو نظم کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ (یہ کتاب انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے)

منوّر کی نظم "مہاتما بدھ" خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ اس میں ایڈون آرنالڈ کی "لائٹ آف ایشیا" کی سی تفصیل اور مرصع کاری نہیں، نہ سروجنی نائیڈو کا سا ایجاز لیکن ایک خاص وقار ضرور ہے۔ منوّر کا مزاج کلاسکی ہے۔ اختصار و رومانیت اسکا سہاگ ہیں۔ انھیں عناصر نے مِل جُل کر اس نظم میں غزل کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔ تاریخ کا بیان ہمیشہ خشک ہوتا ہے، لیکن شعر کی تاثیر اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اُڑائی میں یہ کس نے دھجیاں ملبوسِ شاہی کی ـــــ ملا کس کو نشانِ خاک و خوں دیہیم و افسر میں

تن آسانی ہوئی کس کے لئے وجہِ گراں جانی ـــــ نظر آئے نہاں کانٹے کسے پھولوں کے بستر میں

نہ کر پایا کسنے کاشی کا علم و فضل آسودہ — کسے اُلجھن ہوئی ویدوں کی تفسیروں کے چکر میں
رُلایا ایک مردِ زار نے برسوں لہو کس کو — عجب تاثیر تھی ہیکس کی بیماری کے منظر میں،
تڑپ اُٹھا مصیبت دیکھ کر یہ کون پیری کی، — بھری تھی مثل شعلہ آگ کس کے قلب مضطر میں
جنازہ دیکھنا کس کے لئے اک درسِ عبرت تھا — آلِ زندگی سے درد پیدا ہوگیا سر میں

منور نے بدھ کی تاریخ کو کتنے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اگر اس نظم کا عنوان پڑھنے والے کو معلوم نہ ہو جب بھی وہ جان جائے گا کہ یہ نظم مہاتما بدھ سے متعلق ہے اور یہی اس نظم کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

سکھوں کے پہلے گرو، گرو نانک دیو اور دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ کی شان میں بھی متعدد نظمیں کہی ہیں۔ گرو نانک سے منور کی عقیدت بے سبب نہیں۔ منور کا مشرب گرو نانک کا مشرب ہو یا نہ ہو لیکن دونوں میں ایک گہری مطابقت ضرور ہے اور پھر گرو نانک صاحب کا مسلک بھی کوئی ایسا مسلک نہیں جس کی نوعیت سب سے علٰحدہ ہو۔ دُنیا کے بیشتر بڑے مذاہب کی طرح انکے مذہب کی بنیاد بھی ذاتِ واحد کی پرستش، اخوت اور ہمدردی پر ہے۔ منور کی حقیقت پسند اور انسان دوست نظریں سکھ مت اور گرو نانک کی ذات میں وہ صفات پالیتی ہیں جن سے منور کو خاص لگاؤ ہے۔ اس نے ان نظموں میں تعریفوں کے پُل نہیں باندھے ہاں کہیں کہیں ان کے اشعار سپاٹ البتہ ہوگئے ہیں۔

ایثار، قربانی اور حوصلہ مندی کے پُتلے گورو گوبند سنگھ کو بعض مورخوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے دیدہ و دانستہ ایک فرقہ وار لیڈر کے روپ میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کا نصب العین ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا تھا اور منور کو ان سے عقیدت غالباً اسی سبب سے ہے۔

مناسب پس منظر کے بغیر کوئی تصویر اچھی طرح اُبھر نہیں سکتی، ایک کامیاب مصور مؤثر کی ایک دو جنبشوں ہی سے تصویر کا یہ پس منظر پیش کرکے تصویر کا حُسن دوبالا کر دیتا ہے۔

نظم "دسویں گرو کی یاد میں" گرو گوبند سنگھ کی مجاہدانہ زندگی کی بڑی عمدہ تصویر ہے اور منور نے ایک کامیاب شاعر کی طرح تین چار اشعار کہہ کر نظم کا پس منظر بڑی خوبصورتی سے پیدا کرلیا ہے، جس کا بیشتر انحصار تاریخی شہادتوں پر ہے۔ منور کی طبیعت کے جوہر ان نظموں میں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس نے حضرت محمدؐ اور حضرت علیؓ کی شان میں کہی ہیں۔[1]

خوب سے خوب تر کی تلاش اسے اسلام کے قریب لے آئی ہے۔ منور کی نکتہ رس نظروں نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن شریف اور ویدوں کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ وہ جان گیا ہے کہ اسلام کا مدعا عشق الٰہی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایک تاریک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ جب قومیت کا آفاقی جذبہ چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹکر رہ گیا تھا۔ یہ ہندوستانی عوام کی خواہش نہ تھی، یہ وقت کی ضرورت نہ تھی، اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ تفریق اسلام اور ہندومت کی تعلیمات میں ناروا تھی۔ ہندوستان کے مختلف مذاہب میں اتحاد و آشتی کی اولین کوشش ۱۸۲۸ء میں ہوئی جب راجہ رام موہن رائے

---

[1] خود کو مٹا چکا تھا یہ راہ نیاز میں، — توحید کی صدا تھی نہاں اسکے ساز میں
عرفاں کا نور سینۂ صافی میں بھر دیا — دیر و حرم کے فرق کو نابود کر دیا
قرآن اور ویدوں کو باہم ملا دیا، — دونوں میں تھا جو فرق نمایاں مٹا دیا
ناقوس کی صدا کے مطالب بیاں کئے — راز نہاں نماز و اذاں کے بیاں کئے

"کائنات دل" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۵

نے ، برہمو سماج کی تحریک چلائی - بعد کو کانگرس کے قیام کے ساتھ " ہندو مسلم سکھ عیسائی، آپس میں بھائی بھائی " کا نعرہ زباں زدِ خاص و عام ہوگیا تھا لیکن مخالف عناصر بھی کارفرما تھے - ایسے میں ماحول سے آنکھیں چُرانا ممکن نہ تھا - یہی وجہ ہے کہ جب منوّر ، حضرت محمدؐ کی شان میں نظم کہتا ہے اور اسلام کی تعلیمات اور اوصاف بیان کرتا ہے تو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پیدا کردہ تفرقات اس کی نظروں میں کھٹکنے لگتے ہیں - جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے منوّر کی عقیدت آنکھیں رکھتی ہے ، وہ سائنس اور سیاست کی دنیا میں سانس لیتی ہے - منوّر بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے :-

ہو بنا نفرت پہ جس کی یہ وہ مذہب ہی نہیں — دوسروں سے ترک اُلفت اسکا مقصد ہی نہیں
سرزنش کافر کی اور اسلام ناممکن ہے یہ — ہو دل آزادی سے اس کو کام ناممکن ہے یہ
قلب کے جذبات حیوانی کا یہ مظہر نہیں، — نفس کے افعال شیطانی کا یہ مصدر نہیں
مذہبی دیوانگی کچھ داخل پیکر نہیں — عقل پر صیقل یہ کرتا ہے جنوں پرور نہیں

اسلام کی ان بنیادی تعلیمات سے انحراف کرنے والوں کے لئے منوّر کہتا ہے :-

اور جو قایل ہے اس کا وہ مسلماں ہی نہیں
بندہ اسلام ہو کیسے جو انساں ہی نہیں

منوّر کو سیاستدانوں اور ارکانِ حکومت سے اسے آلۂ کار بنا لینے کا شکوہ ہے ، وہ پیغمبر اسلام کو واپس آنے اور اپنے بندوں کو صحیح راستوں پر لگانے کی دعوت دیتا ہے - منوّر نے اسلام کے رہبر کو لوٹ آنے کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد و آشتی کا پیغام بھی دیا ہے - اس پیغام کا درس اس نے حضرت محمدؐ صاحب کی تعلیمات ہی سے حاصل کیا ہے - اس کا یہ جذبہ قابل ستایش ہے - منوّر نے قرآن شریف کے بعض حصص کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے ، جو " ادب " کراچی ، " کتابی دُنیا " لاہور اور " تحریک " دہلی میں شایع ہو چکا ہے -

منوّر سناتن دھرمی ہے اور بڑا وسیع القلب انسان - نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ رشی دیانند کی عظمت کا ترجمان[1] ہے - اس نے سوامی دیانند پر متعدد نظمیں کہی ہیں - ان نظموں کا اسلوب گو جداگانہ ہے لیکن ان میں بات کم و بیش ایک ہی بات کہی گئی ہے - ان نظموں میں سوامی دیانند کی تعلیمات ، ان کی عظمت اور ان کی کامیابیوں کی تشریح و تصریح کی گئی ہے - مضمون[2] آفرینی کے بعض اچھوتے نمونے ان نظموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں -

سرزمین پنجاب کے مجذوب درویش سوامی رام تیرتھ اور جینیوں کے عظیم پیشوا " اہنسا دھرم[3] کی موہنی مورت " جینندر نے بھی اپنے نظریات و تعلیمات سے بڑا متاثر کیا ہے -

آخر میں ان نظموں کا ذکر بھی کچھ بے جا نہ ہوگا جو منوّر نے سناتن دھرم کے پیشواؤں اور برگزیدہ ہستیوں سے متعلق لکھی ہیں - سناتن دھرم سے عقیدت منوّر کو ورثے میں ملی ہے اور سناتن دھرم سے منوّر کی عقیدت بجائے خود ایک موضوع ہے -

---

[1] کائناتِ دل ، صفحہ ۱۸۱

[2] ریفارمر دہلی - دیوالی نمبر ۱۹۵۱ء

کتنا فروغ بخش رشی کا وجود تھا — آئی اجل تو جب بھی چراغاں ہوئے کئی

(سوامی دیانند کا انتقال دیوالی کے روز ہوا تھا)

[3] کائناتِ دل ، صفحہ ۱۸۹ ، اور صفحہ ۲۱۳ -

منور نے اتنی نظمیں کہی ہیں کہ ان سے ایک الگ کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے۔ شری رام چندر، شری کرشن، رکمنی، ہنومان، رشی والمیک، رشی وید ویاس، ارجن گیتا، گنگا، نند گاون، وجے دسمی، تلسی داس کی رامائن اور کئی دوسرے موضوعات پر مختلف انداز اور جداگانہ اسلوب سے منور نے نظمیں کہی ہیں۔ اس نے شو اور پاروتی کے پاکیزہ عشق کی داستان۔ کالی داس کی اعلیٰ تخلیق، کمار سمبھو کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ منور کا گیتا کا ترجمہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ بھگتی کا قدیم ترین صحیفہ ہندومت کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ یہ ہندو خیال کا وہ نقطہ ارتقا ہے جہاں سے عالمگیر فلسفے کی بنیاد پڑتی ہے۔ دراصل یہ ہندوستان کی فکری اور ذہنی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ منور کی گیتا کو علامہ کیفی مرحوم نے "ایک ہیرا کوہ نور" قرار دیا۔ دیگر مستقل تصانیف میں "درگا سپت شتی" اور "گجندر موکھش" وغیرہ شامل ہیں۔

منور کے نظرئے اور مزاج کی وضاحت اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے گیتا نجلی کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ گیتا نجلی روح کی عرفانی کیفیت کی ترجمانی ہے۔ یہ اس بے کلی کی مظہر ہے جو سچائی چاہتی ہے اور مذہبی حد بندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتی۔

منور نے اپنی مذہبی نوعیت کی شاعری سے جہاں اپنے عقیدے کی تسکین چاہی ہے وہاں اُردو ادب کو مختلف مذاہب کی روح اور مذہبی پیشواؤں سے روشناس کرایا ہے۔ ادب کو وسعت دی ہے، منور کا یہ اقدام اپنی جگہ بڑا مستحسن اور داد طلب ہے۔

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، پائدار اور ہم وار

اونی ویونگ یارن

اور

ہنیڈ نٹنگ وول

ہمارے ہاں جدید ترین طریقے سے طیار کئے جاتے ہیں۔

گوکل چند رتن چند وولن ملز (پرائویٹ) لمیٹیڈ (انکار پوریٹڈ ان بمبئی)

کوئنز روڈ امرت سر

آیندہ جنگ اور طلسم ہوشربا

(نیاز فتحپوری)

اگر آیندہ جنگ ہوئی (اور جیسا کہ بعض جوتشیوں اور نجومیوں نے ظاہر کیا ہے ۶۲ء میں اس جنگ کا قوی احتمال ہے) تو پھر یہ جنگ بالکل وہی ہوگی جس کا حال آپ طلسم ہوشربا میں پڑھ چکے ہیں۔

وہی ساحری، وہی افسوں گری، وہی عیاری جس کی پیش گوئی قمر وجاہ کر چکے ہیں، سب کی سب آیندہ جنگ میں سامنے آئیں گی۔ اور طلسم ہوشربا کی پوری داستان ایک واقعہ ہوکر رہ جائے گی۔

اس جنگ کے لئے پس پردہ کیا کیا طیاریاں ہو رہی ہیں، کیسے کیسے آلات حرب و ذرایع اقدام و دفاع اختیار کئے جا رہے ہیں ان کا صحیح علم تو انھیں خداوندانِ ارضی کو ہوگا جنھوں نے دُنیا کو تباہ کرنے کی قسم کھالی ہے؛ لیکن حربی اختراعات جدیدہ کے سلسلہ میں جو خبریں کبھی کبھی سننے میں آجاتی ہیں، انھیں کو سُن کر جسم میں رعشہ سا طاری ہوجاتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آیندہ کیا ہونا ہے۔

جان ہیل نے اپنے ایک مضمون میں جو (ریڈرس ڈائجسٹ) کی اشاعت دسمبر ۵۹ء میں شایع ہوا ہے اس "جنگ فردا" کا ایک نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ آیندہ کیسے کیسے آلات حرب و دفاع سے کام لیا جائے گا۔

۱۔ دو سپاہی، دشمن کے ملک میں جاکر کسی پوشیدہ اڈے کو جہاں سے missiles (آتش بار ہرائیاں) سر کی جاتی ہیں، تباہ کر دیتے ہیں، جس کا علم دشمن کو بھی ہوجاتا ہے اور ان کی گرفتاری یقینی ہے، اگر وہ جلد از جلد ذریعہ ہوائی جہاز اپنے ملک کو واپس نہ چلے جائیں۔ مگر ہوائی جہاز وہاں کہاں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں قطعی موت کے سوا کوئی صورت مفر کی نہیں ہے۔ تاہم وہ پریشان نہیں ہوتے اور ایک لاسلکی آلۂ ٹیلی فون کے ذریعہ سے جو ان کی جیب میں چھپا ہوا ہے، اپنے کمانڈر کو ان حالات کی اطلاع دیدیتے ہیں اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک خاموش طیارہ بہت نیچے اُڑتا ہوا آتا ہے اور دو پیپے زمین پر گرا کر چلا جاتا ہے۔ یہ پیپے اسی قسم کے ہیں جن میں تیل بھرا رہتا ہے، لیکن اس وقت ان میں تیل نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ یعنی ایک پیپہ میں باریک، ربڑ کی سی لچیلی لمبی چادر ہے اور دوسرے پیپہ میں ۴۲ ہارس پاور کا ایک چھوٹا سا انجن۔ یہ سپاہی فوراً اس چادر کو پھیلا دیتے ہیں اور پمپ کے ذریعہ سے جو اسی کے ساتھ لگا ہوا ہے، ہوا بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ چادر ایک ہوائی جہاز کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں انجن نصب کر کے دونوں سپاہی بیٹھ جاتے ہیں اور آناً فاناً نگاہ سے غائب ہوکر اپنے فوجی مرکز تک پہونچ جاتے ہیں۔

ممکن ہے یہ قصہ فرضی ہو لیکن ممتنع الوقوع نہیں، کیونکہ فی الحال اس قسم کے جہاز بکثرت طیار ہو رہے ہیں، جن کا وزن صرف ۲۰۵ پونڈ ہے اور ۷۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل ساڑھے چھ گھنٹے تک فضا میں اُڑ سکتے ہیں۔ یہ اختراع امریکہ کے ایک حربی سائنس داں کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ پیادہ فوج کو ہر لحاظ سے اتنا آراستہ کر دیا جائے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں، ہر قسم کی لڑائی میں وہ حصہ لے سکے۔

۲۔ اس وقت تک دشمن کے ٹینکوں اور مشین گنوں کے اڈوں یا ذخیروں کو تباہ کرنے کے لئے بہت قریب پہونچ کر دستی بم پھینکنے کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن اب قریب جانا ضروری نہ ہوگا کیونکہ انھیں رائفل کے ذریعہ سے ۱۲۰ گز دور رہ کر پھینکا

جاسکے گا۔

۴ - اسی کے ساتھ ایک راکٹ سرکرنے والا آلہ ایک ایسا بھی ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ۲۰۵ پونڈ ہے اور جو ساڑھے تین انچ کا راکٹ سرکر کے ہر قسم کی ٹینکوں اور آہن پوش مورچوں کو دور ہی سے تباہ کر سکتا ہے۔

۴ - اسی سلسلہ میں ۱۰۶ ملی میٹر کی ایک ایسی رائفل بھی ایجاد کی گئی ہے جو دھکا نہیں دیتی اور جیپ گاڑی پر رکھ کر ہر جگہ منتقل کی جاسکتی ہے۔ اس کے سرکرنے کے لئے صرف دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے یہ ایک میل کے اندر جو چیز سامنے آجائے اسے خاک سیاہ کر دیتی ہے۔

۵ - بلندی پر اڑنے والے جنگی جہازوں کو مار گرانے کے لئے تو لمبی رینج کی بندوقیں پچھلی جنگ میں بھی استعمال ہوتی تھیں، لیکن ان حملہ آور جہازوں کے لئے جو بہت نیچے پہونچ کر بم گراتے تھے، یہ بندوقیں بیکار تھیں - اب اس کا علاج بھی سوچ لیا گیا ہے، ایک خاص آلہ جسے "سرخ آنکھ" کہتے ہیں، طیار کیا گیا ہے جو ۴ فٹ لمبا ہے اور وزن میں صرف ۲۰ پونڈ - یہ گویا ایک قسم کی رائفل ہے جس کی گولی کے سرے پر ایک ایسی چیز نصب ہوتی ہے جو گرمی کی لہروں کا تعاقب کرتی ہے اور از خود وہ بمبار جہازوں تک پہونچ کر انھیں تباہ کر دیتی ہے۔

۶ - اڑنے والی جیپ گاڑی تو اب سے پہلے بن چکی تھی، لیکن اس سلسلہ میں ایک بڑی عجیب چیز اور ایجاد ہوئی ہے، جسے "اڑن کھٹولا" کہنا چاہئے - یہ ایک قسم کا اڑنے والا تختہ ہے بڑی پلیٹ یا سینی کی صورت کا جس پر ایک سپاہی کھڑا ہو کر زمین سے پانچ فٹ اونچا ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جہاں چاہے آسانی سے پہونچ سکتا ہے۔

۷ - اسی سلسلہ میں ایک زقند یا چھلانگ بھرنے والے آلہ کا حال بھی سن لیجئے، یہ ایک بڑی سی پیٹی ہے جس میں چھوٹے چھوٹے پانچ کنستر بندھے ہوتے ہیں اور جو ایک سپاہی کے کولے کے چاروں طرف آجاتے ہیں - ان میں گیس بھری ہوتی ہے - ان کی مدد سے ایک سپاہی چھلانگ لگا کر ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑی بڑی بلند عمارتوں کی چھتوں تک پہونچ جاتا ہے اور اونچی اونچی دیواروں کو پار کر لیتا ہے۔

۸ - فوجوں کو منتقل کرنے کا سوال بڑا اہم سوال ہے - اس وقت تک یہ دستور تھا کہ بڑے بڑے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے انھیں محاذ پر بھیجا جاتا تھا - لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ جہازوں کے اترنے کے لئے ایک بڑا میدان چاہئے اور دشمن سے قریب ایسی جگہ ملنا آسان نہ تھا، اس دشواری کو دور کرنے کے لئے اب کاپٹر قسم کے بڑے بڑے جہاز طیار کئے گئے ہیں جو زمین سے بلند ہو کر آسانی سے دشمن کے عقب میں پہونچ جاتے ہیں۔ اور چونکہ اب ایسے غبارے بھی طیار ہو رہے ہیں جو ۵ فٹ کی بلندی سے بھی اترنے میں کام دیں گے، اس لئے فوج آسانی سے مناسب مقام پر پہونچ جایا کرے گی۔

۹ - اس وقت تک ٹینک اور فوجی گاڑیاں بہت وزنی ہوتی تھیں، جن کو آسانی سے ادھر اُدھر لے جانا بہت دشوار تھا، لیکن اب یہ سب ہلکے وزن کے المونیم سے طیار ہوں گی تاکہ زمین پر بھی تیز چل سکیں، ہوا میں بھی اڑ سکیں اور دریا سے بھی کشتی کی طرح گزر جائیں۔ ان کے انجن معمولی پٹرول، ڈیزل تیل اور گیس ہر ذریعہ سے بہ آسانی حرکت میں آسکیں گے۔

۱۰ - اس جوہری جنگ کے زمانہ میں ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ دور دراز مقامات کی فوجوں کو پٹرول وغیرہ کیونکر پہونچایا جائے اس کے لئے ربڑ کے بڑے بڑے تھیلے طیار کئے گئے ہیں جن میں گیس یا پٹرول بھر دیا جائے گا اور انھیں جوہری طاقت رکھنے والی ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے منتقل کیا جائے گا - اسی کے ساتھ پٹرول فراہم کرنے کے لئے ربڑ کے پائپ کام میں لائے جائیں گے جو ایک گھنٹہ کے اندر ۲۰ میل تک دور دور بچھائے جاسکتے ہیں۔

۱۱ - آیندہ جنگ کی وسعت کے پیش نظر ایک مشکل سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں پھیلی ہوئی

فوجوں سے ربط کیونکر قایم رہ سکے گا اور ان کو ہدایات کیونکر جلد پہونچائی جا سکیں گی، اس سوال کو لاسلکی ریڈیو نے آسانی سے حل کر دیا ہے - ہر سپاہی کی ٹوپی کے اندر سیگریٹ کے پیکیٹ کے برابر ایک ریڈیو سٹ نصب ہوگا جس کے ذریعہ سے وہ اپنا پیام بھیج سکے گا اور دوسرے کا سُن سکے گا۔

۱۲- دور دراز فاصلہ پر، رات کے وقت، خراب موسم میں، دشمن کا سراغ لگانا ناممکن تھا، لیکن اب یہ بھی ممکن ہوگیا ہے، اسکے لئے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص میلوں دور ہو تو اس کے قدموں کی چاپ بھی اس آلہ کے ذریعہ سے سنی جا سکتی ہے۔ علاوہ اس کے Infra-red شعاعوں والی ایسی دوربین بھی طیار ہوگئی ہے جو تاریک رات میں بھی کام دیتی ہے ایک خاص آلہ ایسا بھی ایجاد ہوا ہے جس کی مدد سے رات کی تاریکی، بارش، کہر اور برفباری میں بھی بارہ سو فٹ تک کی چیزیں صاف نظر آسکتی ہیں۔ اس آلہ سے ایک خاص شعاع ایسی بھی نکلتی ہے جس سے دشمن کی سپاہیوں کے جسم سے پیدا ہونے والی حرارت یا گرمی کا پتہ چل جاتا ہے اور دشمن کا محاذ معلوم ہو جاتا ہے۔

۱۳- آیندہ جنگ میں جوہری آلات کی جنگ ہوگی، زہریلی اور جراثیم افشاں گیس سے بھی کام لیا جائے گا ——— اس سے بچنے کے لئے ہر سپاہی کے پاس ربڑ کا ایسا سوٹ ہوگا کہ اس کے پہننے کے بعد وہ زہریلی گیس سے محفوظ رہے گا۔ اس سوٹ میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ سانس لینے کے لئے اسے آکسیجن باہر سے نہ لینا پڑے بلکہ خود اس کے اندر ہی آکسیجن کا کافی ذخیرہ موجود ہوگا۔ اس کے جسم کے جو حصے کھلے رہیں گے ان کو بھی جوہری گرمی سے محفوظ رکھنے کا خاص انتظام ہوگا۔

اگر اسے کبھی ضرورت ہوگی کہ وہ زمین کے اندر گڑھا کھود کر چھپ جائے، تو ایک دستی راکٹ کی مدد سے وہ بہ آسانی تین فٹ گہرا گڑھا بنا کر اس کے اندر چھپ جائے گا اس کے لئے پھاوڑا یا کدال کی ضرورت نہ ہوگی۔

۱۴- ہر سپاہی ایسے برقی آلات سے مسلح ہوگا جو دشمن کے کھوج لگانے والے راکٹ کو غلط راستہ پر ڈال دے گا۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے

حرفِ اختر

"کپور سپن"

KAPUR SPUN.

ہی ہے

تیار کردہ - کپور سپننگ ملز - ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز امرتسر

ذوقؔ بنِ ذوقؔ

(محمد انصار اللہ نظرؔ)

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

عجیب بات ہے کہ ذوقؔ کا یہ شعر اُن پر پوری طرح صادق آیا۔ ذوقؔ کا نام ان کی اولاد معنوی (ان کے کلام) کے سبب آج تک زندہ ہے، لیکن اولاد ظاہری کو کوئی نہیں جانتا۔ ذوقؔ اپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے اور خدا نے ان کو بھی ایک ہی لڑکا عطا کیا (محمد اسماعیل)[1]

صاحبزادہ کا نام اپنے نام (محمد ابراہیم) کی مناسبت سے "محمد اسماعیل"[2] رکھا۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی پیدائش کب ہوئی تھی، البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) سے بہت پہلے ان کی ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا محمد حسین آزادؔ نے نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی فیاضی کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے:۔

"خلیفہ صاحب (یعنی محمد اسماعیل) چھوٹے سے تھے، ایک دن استاد کے ساتھ (نواب معروفؔ کے یہاں) چلے گئے۔۔۔ رخصت ہوئے تو (نواب صاحب نے) ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زریں زین کسا ہوا، اس پر سوار کرکے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے، کیا جانے گا کہ میں کیا تھا۔"[3]

اس واقعہ کی صحت اگر تسلیم کر لی جائے تو خلیفہ محمد اسماعیل کی پیدائش کا زمانہ ۱۲۲۴ھ کے قریب کا معلوم ہوتا ہے اور یہ وقت وہ تھا جب ذوقؔ دلی عہد بہادر میرزا ابو ظفر ظفرؔ کو اصلاح دینے پر مامور ہو چکے تھے اور ان کی شاعری ارتقائی مدارج

---

[1] محمد اسماعیل، مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھی تھے، عمریں اگرچہ کافی بڑے تھے ——— لیکن ذوقؔ اور مولوی محمد باقر کے تعلقات کے پیش نظر اسماعیل اور آزاد میں برادرانہ تعلقات ہونا قدرتی امر ہے لیکن اس "استاد پرست" شاگرد نے دیوان ذوقؔ مرتب کیا، ایک تذکرہ (آب حیات) لکھ کر استاد کے حالات کو محفوظ کیا مگر افسوس ہے کہ استاد زادہ کے حالات ضمناً بھی نہ لکھے، حالانکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ استاد زادہ کا ذکر خود استاد کے حالات سے براہ راست متعلق تھا، آزاد کے سب ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد اسماعیل، ذوقؔ کے تنہا نور چشم تھے۔

"میں نے اور خلیفہ اسماعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں" (آب حیات: ۵۸۲)

"پھر میاں اسماعیل یعنی اپنے بیٹے نے لئے اور اپنے عیال اور خاص خاص درمندوں کے لئے (دعا کرتے تھے" (دیوان ذوقؔ: ۲۵)

[2] محمد اسماعیل عموماً "خلیفہ صاحب" یا "خلیفہ اسماعیل" کے نام سے مشہور تھے اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، محمد اسماعیل اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، یقیناً ذوقؔ کو ان سے خاص محبت رہی ہوگی، چنانچہ تلامذۂ ذوقؔ، محبت کے سبب اپنے استاد زادہ کا نام لینے کے بجائے ان کو "خلیفہ صاحب" کہتے رہے ہوں گے۔

[3] دیوان ذوقؔ مرتبہ آزاد مطبوعہ علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۳ء: ۱۳ھ (آب حیات مولانا آزاد۔ صفحہ ۵۵۹ - ۵۶۰

طے کر رہی تھی البتہ دربار ولی عہدی سے وظیفہ کی رقم اتنی[1] قلیل ملتی تھی کہ بسر فراخی سے نہ ہو سکتی ہوگی۔

شیخ محمد اسماعیل کی تعلیم و تربیت کس طرح ہوئی اور کن کن استادوں سے انھوں نے فیض پایا یہ معلوم ہونا بہت مشکل ہے، جبکہ خود ذوق کے حالات بھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں قلمبند کیا ہے :-

"حضرت ذوق کو دن رات شعر گوئی کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا اپنے صاحبزادہ محمد اسماعیل کی تعلیم کی بھی فکر نہ تھی۔ ان کے دوستوں نے کہا حضرت فکر سخن تو خیر کرتے رہے گا۔ بچے کی تعلیم کا بھی لحاظ رکھئے اس سے ہی آپ کا نام چلے گا، کہتے ہیں ؎

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت"[2]

لیکن یہ لطیفہ محض قیاس پر مبنی معلوم ہوتا ہے، اس شعر کے مطابق مختلف حضرات نے عجیب و غریب لطیفے[3] وضع کر کے ذوق کی طرف منسوب کر رکھے ہیں، لیکن ذوق کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ بچے کی تعلیم و تربیت سے "بے خبر" تھے، صحیح نہیں معلوم ہوتا، مولانا محمد حسین آزاد کا بیان کردہ اول الذکر واقعہ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذوق بسا اوقات صاحبزادہ کو نوابین اور امراء کے یہاں بھی لے جاتے تھے اور یہ بھی بچے کی تربیت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، کیونکہ وہاں آداب مجلس کے اصول معلوم ہوتے ہیں۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ "خاقانیٔ ہند" کے بیٹے کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی رہی ہوگی، کیونکہ ماحول ہی ایسا تھا، وہ شعر کہتے تھے _____ (جیسا کہ ان کے تخلص "فوق"[4] سے ظاہر ہوتا ہے) لیکن افسوس ہے کہ ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذوق خود ان کو بہ وجہ مصروفیت اصلاح نہ دے سکتے ہوں گے اور مشورۂ سخن اپنے کسی شاگرد کے ذمہ رکھا ہوگا۔ منشی جگناتھ پرشاد فیض نے اردو شعراء کا ایک "شجرہ"[5] مرتب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوق، گرم کے شاگرد تھے۔ محمد مظفر خاں گرم رام پور کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام محمد خاں تھا اور یہ ذوق کے شاگرد تھے، ان کا ذکر قدیم تذکروں میں ملتا ہے۔[6]

فوق کی تعلیمی کیفیت کا اندازہ ان کے مشاغل سے بھی کیا جا سکتا ہے جو مختلف النوع ہیں، اگرچہ تفصیل ان مشاغل کی بھی معلوم نہیں لیکن اجمالی ذکر ذیل کے اقوال میں مل جاتا ہے :-

---

[1] یہ رقم بقول آزاد کل چار روپیہ ماہانہ تھی (آب حیات، ص ۵۱۵)

[2] لطایف الشعراء

[3] مثلاً اسد ملتانی صاحب نے دیوان ذوق کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ غالب مرحوم نے ذوق کو اولاد کا طعنہ دیا ذوق نے فی البدیہہ شعر مذکور کہا حالانکہ غالب کسی کو طعنہ کیا دیتے خود ان کا یہ حال تھا کہ اولاد ہوتی تھی مگر زندہ نہ رہتی تھی، یہاں تک تو خیر ممکن ہے کہ محمد اسماعیل کی ولادت سے پہلے کسی نے ذوق کو کچھ کہا ہو اور جواباً یہ شعر موزوں کر دیا ہو۔

[4] تاریخ عروج عہد انگلشیہ مصنفہ شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب۔ صفحہ ۲۱، وغیرہ۔

[5] تذکرہ گلزار سخن مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۲۶ھ صفحہ ۵۱۲

[6] تذکرہ سراپا سخن مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۸۹۵ء۔ صفحہ ۳۶۲ — گرم کا ایک شعر نمونتہً ملاحظہ فرمائیں ؎

سر سے پا تک داغ ہوں، ہر داغ گویا چشم ہے کرتے ہیں لے جاناں ترے رخ کے نظارے ہاتھ پاؤں

"یہ غزل بادشاہ کی ہے، خلیفہ مرحوم نے بہ سبب دیوان میں داخل نہ ہونے کے استاد کی بیاض میں لکھ دی ہے استاد مرحوم کے خاص کلام میں کہیں نہیں"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب اپنے پدر والا قدر کا کلام بھی جمع کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ذوقؔ کے انتقال کے بعد انھوں نے دیوان کی ترتیب کا کام شروع کیا، لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں خود "قابلِ دار" ٹھہرے اور دل کی حسرت دل ہی میں لے گئے، اس کا تفصیلی ذکر آزاد کی زبانی سنئے :-

"وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسماعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا، محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا کیونکہ بچپن سے لے کر دم واپسیں تک کا کلام انھیں میں تھا اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی اور بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔
چنانچہ اول ان کی غزلیں اور قصاید انتخاب کرلئے یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔۔
دفعۃً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسماعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رخصت کرگئے"[2]

اگر عمر وفا کرتی اور ذوقؔ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوجاتے تو یقین ہے کہ خاقانیِ ہند کا کلام صحیح صورت میں جمع ہوجاتا اور اُردو شاعری کے میدان میں بڑا کام ہوتا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں بڑی بڑی مصیبتیں آئیں ——— بقول آغا محمد طاہر مرحوم "مسلمانوں پر پیمبری وقت پڑ رہا تھا، بے گناہ موت کے گھاٹ اُتارے جارہے تھے۔ نفسی نفسی کا عالم تھا، خلیفہ اسماعیل بھی جان کے خوف سے قدم شریف میں روپوش ہوئے، یہیں ان کے والد شیخ ذوقؔ کا مزار بھی ہے، کسی بد باطن نے مخبری کی، گرفتار ہوکر آئے اور بقول خواجہ حسن نظامی :-

"بیس ستمبر کو بے گناہ مسلمان قتل ہوئے، جو لوگ تلوار سے بچ رہے انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ان میں ۔۔۔۔۔۔۔
خلیفہ اسماعیل ..... خصوصیت سے قابل ذکر ہیں"[3]

خلیفہ صاحب کا جرم جس کے لئے انھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑا مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب نے بیان کیا ہے:-

"ذوقؔ کا بیٹا فوقؔ اس سبب سے پھانسی دیا گیا کہ وہ ایام غدر میں بادشاہی اہلکار تھا"[4]

بادشاہی اہلکار ہونے کی حیثیت سے فوقؔ کو مختلف خدمات سرکارِ شاہی سے حاصل تھیں مثلاً :-

"اکثر مشاعروں میں (بادشاہ کی) غزل خلیفہ اسماعیل مرحوم پڑھا کرتے تھے"[5]

"خلیفہ اسماعیل صاحب کو سرکارِ شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں، انھیں میں بقول شاہی (املاک و باغات) بھی سپرد تھے"[6]

"مرزا مغل بیگ ..... کی جگہ پر حامد علی نام لکھنؤ کے ایک شریف زادے قلمدانِ وزارت سے سرفراز ہوئے ۔۔۔۔۔
استاد ذوقؔ کی ترقی ہوئی ..... اور ان کے لڑکے خلیفہ محمد اسماعیل کو بھی چند خدمتیں سپرد ہوئیں"[7]

"۵ رجون ۱۸۴۸ء کو بادشاہ سلامت نے خلیفہ اسماعیل کو خلعت شش پارچہ و سہ رقم جواہر عنایت کئے"[8]

---

[1] مجموعہ مکتوبات آزاد، مرتبہ آغا محمد طاہر، شایع کردہ آزاد بکڈپو دہلی، صفحہ ۲۵۵ (مکتوب حافظ غلام رسول ویرانؔ بنام آزاد مورخہ ۲۵ راگست)
[2] دیوان ذوقؔ: ۲۷-۳۰ غدر کی صبح و شام: ۸۶ — [3] تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ: ۱۲۱ — [4] دیوان ذوقؔ: ۱۲۴ — [5] ایضاً: ۵۴ -
[6] بہادر شاہ ظفر، از امیر احمد علوی: ۸۳ — [7] بہادر شاہ ظفر از امیر احمد علوی، ایضاً از رئیس احمد جعفری: ۱۵۹ -

اس اعزاز اور امتیاز کے ساتھ ساتھ خلیفہ صاحب کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد کی ذیل کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے :-

"حکیم احسن اللہ صاحب طبیب شاہی ..... خلیفہ صاحب سے بے سبب کھٹکتے تھے خیال تھا کہ حضور پھر انھیں خدمت سپرد نہ کریں ... حالانکہ استاد (ذوقؔ) نے ترقی و تنزل خلیفہ کے کسی معاملہ میں کبھی دخل ہی نہ دیا" صفحہ ۱۷

"خلیفہ اسماعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں اس لئے اسے ہمیشہ خطر تھا کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں" ص ۱۸

اگرچہ آزاد کے ان دونوں بیانات میں فرق ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ حقیقت ہو، حکیم صاحب انگریزوں سے ساز باز رکھتے تھے جیسا کہ خود بادشاہ کے اس مصرعہ سے ظاہر ہے ؎ "کہ دشمنوں سے رکھے ہے مرا طبیب اخلاص"

ایسی صورت میں لازماً وہ ہر اس شخص سے کھٹکتے رہے ہوں گے جو ان کی مقصد برآری میں مخل ہو سکتا تھا لیکن معلوم ہوتا کہ بادشاہ خلیفہ صاحب کو برابر مانتے رہے چنانچہ ۱۸۵۴ء میں "جب ذوقؔ کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے خلیفہ اسماعیل کو خلعت تعزیت سے نوازا"

معلوم ہوتا ہے کہ محمد اسماعیل بھی سرکار شاہی میں نذر پیش کرتے رہتے تھے مثلاً :-

"۱۰ ستمبر ۱۸۴۹ء جمعہ - محمد اسماعیل نے پاکھل کے ڈیڑھ سو دانے شاہی خدمت میں بھیجے حضور والا نے لانیوالے کو دو روپیہ عنایت فرمائے"

اس سے قلعہ میں ان کی رسائی ہونا ظاہر ہے۔

---

۱ دیوان ذوقؔ : صفحہ ۱۳ - ۲ ایضاً : صفحہ ۳۰۱ - ۳ بہادر شاہ ظفر، از علوی - ۴ رزیڈنٹ کی ڈائری، از خواجہ حسن نظامی: ۲۴۹-۲۵۰

ادارۂ فروغ اُردو (نقوش) لاہور

کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ رجسٹری مل جائیں گے (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجے جا سکتے) آرڈر دس روپیہ سے کم کا نہ ہو، اور محصول بحساب پندرہ فی صدی روانہ کیا جائے۔ منیجر نگار لکھنؤ

سالانہ چندہ نقوش : ۲۵ روپے

نمبر ۶ مجلد ..... ۷ روپے	پطرس نمبر ..... ۸ روپے
مکاتیب نمبر ..... ۱۲ روپے	شخصیات نمبر ۲ مجلد ۱۰ روپے
طنز و مزاح نمبر ... ۱۰ روپے	ادب العالیہ نمبر ... ۱۲ روپے

تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور اُنکی تاریخی و مذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی۔

یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور اُردو زبان میں یقیناً یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو خالص موضوع پر اس قدر احتیاط و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔

قیمت چار روپیہ
منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

(۱)

اُوم

(رفیع الدین صاحب ۔ اجین)

ہندو مذہب میں لفظ اُوم کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور پوجا پاٹ میں بھی یہ لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ غالباً یہ لفظ بھگوان اور پرماتما کا مفہوم بھی رکھتا ہے، لیکن معلوم نہیں اس لفظ کی اصلیت کیا ہے۔

(نگار) لفظ اُوم، قدیم آریائی زبان کا لفظ ہے جو رگ وید میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو آپ نے ظاہر کیا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے بھی زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ لفظ قدیم آریائی زبان کے باقیات میں سے ہے، اس سے ملتا ہے کہ لاطینی زبان میں بھی ایک لفظ اومنس (omnus) موجود ہے جس کے معنی کل کے ہیں۔

یہی اومنس انگریزی میں اومنی (Omni.) ہوگیا اور اس سے بہت سے الفاظ وضع ہوئے۔ اور ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں کلیت کا مفہوم نہ پایا جائے مثلاً:۔

Omni potent.	قادرِ مطلق
Omni potence.	قدرت مطلقہ
Omni presence.	ہمہ جائی
Omni Science.	علمِ بسیط۔ معرفت کلی
Omni Scient.	عارف ۔ ہمہ داں

الغرض "Omni" جس لفظ سے پہلے آتا ہے اس میں جامعیت، کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ Omnibus. بھی اسی گاڑی کو کہتے ہیں جو مال، اسباب و انسان سب کو اِدھر اُدھر لے جاتی ہے اور Omnivorous. وہ ہے جو سب کچھ کھا سکتا ہے اور کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتا۔ اسی طرح اُس مجمع کو جس میں عام و خاص سب طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، Omnium gatherum. کہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ فارسی میں آو۔ آم اور ہمہ بھی یہی ہیں۔ آپائی قومیں جب اِدھر اُدھر منتشر ہوئیں تو وہ اپنی زبان بھی ساتھ لے گئیں لیکن بعد کو دوسری قوموں کے میل جول سے اس میں تغیر ہوتا رہا۔ ہوسکتا ہے کہ اصل لفظ اُوم ہی ہو، جو اطالیہ میں، اومنی (Omni.) ہوگیا اور فارسی میں ہمہ یا ہم۔ صوفیہ کے یہاں "ہمہ اوست" بالکل وہی چیز ہے جسے سنسکرت میں اوم کہتے ہیں

اوم کا مفہوم سنسکرت میں بھی اتنا ہی وسیع ہے جیسے عربی میں اللہ کا۔ اوم میں جو تصور پوشیدہ ہے وہ بڑا جان بین، ہمہ گیر اور آفاقی و کائناتی قسم کا ہے۔ اسی لئے اوم اور اللہ، دونوں اسماء ذاتی خیال کئے جاتے ہیں اور "عقلِ کل" کا مفہوم رکھتے ہیں۔ غالباً اسی بناء پر مسلمانوں کے بعض محققین اللہ کو اسم اعظم کہتے ہیں۔ اور ہندوؤں میں بھی اوم یہی اہمیت رکھتا ہے۔

(۲)

بعض زحافی ارکان

(جناب سعد - ہدایت پوری)

وتدِ مجموع کے اول حرفِ متحرک کے حذف کرنے کو ثلم کہتے ہیں اور یہی تعریف خرم کی ہے۔ یعنی مفاعیلن میں مفا کا میم ساقط کرنے فاعیلن رہا جسے مفعولن سے بدل لیا، اسی طرح فعولن کی ف کو ساقط کرنے سے عولن بچا اور فعلن سے بدل لیا، لیکن اس کا اصطلاحی نام ثلم رکھ دیا۔

دونوں زحافوں کی ایک ہی تعریف ہے اور دونوں صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہیں، پھر ایک ہی عمل کے دو نام کیسے ؟ اور زحاف ثلم کو بحر طویل و متقارب کے لئے اور خرم کو ہزج، مضارع اور قریب سے مختص کرنے کی کیا وجہ ہے۔

(نگار) آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ زحاف ثلم و خرم ایک ہی چیز ہیں۔ یعنی وتد مجموع (سہ حرفی لفظ) کے رکن اول کے پہلے حرف کو گرا دینا۔ یہ عمل ان بحروں میں ہوتا ہے جن میں مفاعیلن، فعولن اور مفاعلین رکن سالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے اس زحاف کے سلسلہ میں صرف مفاعیلن اور فعولن کا ذکر کیا اور مفاعلین کو چھوڑ گئے، حالانکہ اس میں بھی وتد مجموع کا پہلا حرف گرایا جا سکتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ ان کی وضاحت کر دی جائے۔

۱۔ مفاعیلن، چار بحروں میں رکن سالم کی حیثیت رکھتا ہے : ہزج، مضارع، قریب اور عریض، لیکن آپ نے عریض کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ اس کا مفاعیلن بدل کر مفعولن نہیں ہوتا۔ باقی تین بحروں میں، بے شک مفاعیلن بدل کر مفعولن ہو سکتا ہے اور اس عمل کا اصطلاحی نام خرم ہے۔

۲۔ فعولن۔ دو بحروں میں رکن سالم کی حیثیت رکھتا ہے اور جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا ہے وہ بحریں متقارب و طویل ہیں، ان دونوں میں فعولن بدل کر فعلن ہو سکتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام ثلم ہے۔

۳۔ مفاعلتن بحر وافر کا رکن سالم ہے، اس میں بھی مفاعلتن کے رکن اول کے وتد مجموع کا پہلا حرف م حذف کر کے فاعلتن کر دیتے ہیں اور پھر اسے مفتعلن میں بدل دیتے ہیں، لیکن اس عمل کا اصطلاحی نام عضب ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہی عمل کا نام تینوں جگہ الگ الگ ہے، بحر ہزج، مضارع اور قریب میں اس کا نام خرم ہے۔ بحر متقارب و طویل میں اسے ثلم کہتے ہیں اور بحرِ وافر میں عضب۔

اب رہا یہ سوال کہ ایک ہی عمل کے تین نام کیوں علٰحدہ علٰحدہ رکھے گئے، سو اس میں عضب کا ذکر آپ نے نہیں کیا (شاید اس لئے کہ

یہ بحر وافر سے متعلق ہے جو خاص عربی میں مستعمل ہے اور اُردو فارسی میں رائج نہیں) آپ نے صرف خرم اور اثلم کی بابت سوال کیا ہے کہ یہ دو نام کیوں علٰحدہ علٰحدہ رکھے گئے جبکہ عملاً دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری عروض عربی عروض سے ماخوذ ہے اور عربی اصطلاحات ہی اُردو فارسی میں بھی رائج ہیں، اصلے اصل سوال یہ ہے کہ خود عرب کے ماہرین عروض نے کیوں ناموں میں یہ تفریق پیدا کی۔

آپ کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ ہزج اور مضارع کی ہشت رکنی بحر میں مفاعیلن کبھی مفعولن میں تبدیل نہیں ہوتا، صرف شش رکنی بحر میں ایسا ہوتا ہے[1] اور بحر قریب میں تو خیر آٹھ رکن ہوتے ہی نہیں، یہ بحر ہی چھ رکن کی ہے۔ بحر متقارب میں البتہ ہشت رکنی اور شش رکنی دونوں بحروں میں فعولن کو بدل کر فعلن کر سکتے ہیں۔ اور بحر طویل شش رکنی ہوتی ہی نہیں، ہمیشہ آٹھ رکن یا اس سے زیادہ ہوتے ہیں اور اس میں بھی فعولن بدل کر فعلن ہو سکتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس عمل زحاف کا نام انھوں نے خرم رکھا ہے وہ صرف چھ رکن والی بحروں میں ہوتا ہے اور جس زحاف کا نام انھوں نے ثلم رکھا ہے وہ ہشت رکنی و شش رکنی دونوں بحروں سے متعلق ہے۔ اور صدر و ابتدا کے علاوہ حشو میں بھی ہو سکتا ہے[2]۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ثلم کا عمل بہ نسبت خرم کے زیادہ وسیع ہے۔ اب آیئے غور کریں کہ خرم اور ثلم کا صحیح مفہوم عربی زبان میں کیا ہے:

خرم = پہاڑ کی چوٹی۔ ناک کا بانسہ کٹ جانا۔

ثلم = دیوار میں رخنہ پیدا کرنا، کسی برتن کا کنارہ توڑ ڈالنا، مالی نقصان ہو جانا، کان یا ناک کا پھاڑ دینا یا کاٹ ڈالنا۔

اب آپ ان دونوں کے مفہوم پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خرم میں ضرر کا مفہوم نسبتاً محدود ہے اور ثلم میں زیادہ وسیع۔

---

[1] بحر ہزج: مفعولن، فاعلن، مفاعیل (اخرم، مقبوض، مقصور)
(شیریں کارے کند چو بنیاد)
مفعولن، فاعلن، فعولن (اخرم، مقبوض، محذوف)
(خود را در خود کنی تماشا)
مفعولن، فاعلن، مفاعیلن (اخرم، مقبوض، سالم)
(خورسندم از رخت بدیدارے)
بحر مضارع: مفعول، فاعلاتن، مفعولن (اخرب، سالم، اخرم)
(دارم رو ہجرش از بیتابی)

[2] بحر متقارب: فعلن، فعولن، فعلن، فعولن (اثلم، سالم، اثلم، سالم)
(ہر غنچہ لبش گفت الا دل من)
فعلن، فعولن، فعلن، فعولان (اثلم، سالم، اثلم، مسبغ)
(چندانکہ گفتیم غم با طبیباں)

بحرِ متقارب میں اس عمل کو تلم کہنا اس لئے زیادہ موزوں ہے کہ اس میں یہ عمل تحزیب ہشت رکنی و شش رکنی دونوں بحروں میں ہوتا ہے اور زیادہ وسیع ہے۔ برخلاف اس کے ہزج، مضارع و قریب میں یہ عمل تحزیب چھ رکنی بحروں میں ہوتا ہے جو نسبتاً محدود ہے۔

عربی زبان بڑی وسیع زبان ہے اور اس کے تمام مترادف الفاظ کے مفہوم میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا ہے، اور اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے بھی علٰحدہ علٰحدہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں، چہ جائیکہ محل استعمال بدل جائے کہ اس صورت میں تو وہ کبھی ایک لفظ استعمال نہ کریں گے (خواہ مفہوم میں کتنی یکسانیت کیوں نہ پائی جائے) اسی لئے ایک ہی عمل زحاف کو وہ مختلف بحروں میں مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ بحر وافر میں اسی عمل کا تیسرا نام عضب رکھ دیا۔

---

(۳)

لفظ علّامہ کی تحقیق

(تمنّا یوسفی - عمر آباد)

مولانا ناطق گاؤں ٹھوی تلمیذ داغ دہلوی نے اپنی تازہ تصنیف سبع سیارہ میں لفظ علامہ کے تحقیقی معنی مکارہ کے ہیں، لہٰذا شبلی نعمانی، سلیمان ندوی اور اقبال کے ساتھ اس کا استعمال کسی طرح درست نہیں، اس باب میں آپ کی گرانقدر رائے باعثِ رفعِ تشویش ہوگی۔

(نگار) مجھے حیرت ہے کہ جناب ناطق نے کیوں یہ فرمایا کہ لفظ علامہ کی [illegible] اکابر علماء کے نام کے ساتھ کسی طرح درست نہیں حالانکہ وہ ہر طرح درست ہے۔

عربی میں مبالغہ کے پندرہ اوزان ہیں (جن کی تفصیل کا موقع نہیں)۔ انھیں میں ایک وزن فعّال اور فعّالہ بھی ہے اس لئے علّام اور علّامہ (جو اسی وزن پر ہیں) عالم کا مبالغہ ہیں جس کے معنی ہیں (بہت بڑا عالم) ناطق صاحب نے علامہ کی ت کو جو اُردو میں ہ کی طرح لکھی جاتی ہے، تائے تانیث سمجھ لیا، حالانکہ یہ تائے مبالغہ ہے۔

عربی میں بعض اوزانِ مبالغہ اور بھی ایسے ہیں جن کے اخیر میں ت ہے، لیکن وہ تائے تانیث نہیں، مثلاً:- ضحکۃ (بروزن فعلۃ) بہت ہنسنے والے کے معنی میں۔ راویۃ (بروزن فاعلۃ) بہت بڑے راوی اشعار کے مفہوم میں۔ فروقۃ (بروزن فعولۃ) بہت جزع و فزع کرنے والے کے مفہوم میں۔ ان سب میں تائے مبالغہ ہے، تائے تانیث نہیں۔

اُردو میں علامہ بہ معنی مکارہ ضرور مستعمل ہے، لیکن طنزیہ انداز میں جیسے کسی جاہل کو بقراط کہدیں یا کسی کی انتہائی بے وقوفی ظاہر کرنے کے لئے یہ کہیں کہ "آپ کی عقلمندی ملاحظہ ہو"۔

ایک فروگزاشت۔ نومبر ۶۰ء کے نگار میں "مصحفی کی انفرادیت و شخصیت" پر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ جناب "یوسف سرمست" حیدرآباد اڈیٹر "نگار" کا ہے

باب المراسلہ والمناظرہ

میں اور احمدی جماعت

(نیاز فتحپوری)

جب سے میں نے احمدی جماعت کے متعلق اظہار خیال شروع کیا ہے، اسی وقت سے مجھے یقین ہے کہ دُنیا کو سب سے پہلے یہی جستجو ہوئی کہ وہ شخص جو اپنے عقاید کے لحاظ سے دہریہ یا ملحد قسم کا انسان ہے، کیوں احمدی جماعت کی موافقت کر رہا ہے اور میرزا غلام احمد صاحب کا کیوں اس قدر معترف ہے اور اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس جستجو میں کتنی بدگمانیاں شامل ہوں گی، چنانچہ اس دوران میں جو خطوط ہندوستان و پاکستان کے مختلف گوشوں سے موصول ہوئے ہیں، ان سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

نمونہ کے طور پر ایک خط ملاحظہ ہو۔ یہ خط چمپن کے ایک صاحب شیخ عبداللہ کا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"اخبار والے ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا مضمون ہاتھ آجائے کہ خریداروں میں زبردست اضافہ ہو جائے اس لئے آپ کی موجودہ قلابازی پر کوئی تعجب نہیں۔ پہلے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آپ دہریہ ہیں، اب یہ خیال ہے کہ آپ مرزائی قادیانی ہوگئے ہیں یا ان سے کوئی رشوتِ عظیم کھائی ہے۔ لہذا آپ کی باتیں کوئی وزن نہیں رکھتیں جب تک آیات قرآنی یا احادیث اس کی تائید میں نہ ہوں۔ آیندہ اگر نگار میں قادیانی مذہب کی حمایت کا ارادہ ہو تو قرآن و حدیث سے لیس ہوکر میدان میں آئیں"

اس سلسلہ میں تین الزام مجھ پر عاید کئے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اس سے میرا مقصود صرف نگار کی توسیع اشاعت ہے ——— دوسرے یہ کہ میں، احمدی ہوگیا ہوں، لیکن بدنامی کے اندیشہ سے اسے کھل کر ظاہر نہیں کرتا ——— تیسرے یہ کہ تبلیغ احمدیت کے لئے مجھے احمدی جماعت کی طرف سے (انھیں کے الفاظ میں) "کوئی رشوتِ عظیم" ملی ہے۔

ان میں کوئی خیال ایسا نہیں جو انوکھا ہو، کیونکہ دُنیائے صحافت و تبلیغ میں ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی کہ محض ذاتی اغراض کی بنا پر لوگوں نے اپنا Creed بدل دیا، اپنا مذہب بدل دیا، اپنی وطنیت و قومیت بدل دی — لیکن جس حد تک نگار اور میری ذات کا تعلق ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ :-

گفتہ بودی ہمہ زرق اند و فریب اند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

ساری دُنیا کو معلوم ہے کہ "نگار" کا ایک خاص حلقہ ہے، ان حضرات کا جو ادب، سیاست و مذہب ہر چیز میں آزادی فکر و خیال کے حامی ہیں اسی لئے اُس وقت بھی جب پورے ہندوستان میں میرے اور نگار کے خلاف الزام دہریت و الحاد کا طوفان برپا تھا، نگار کی اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور ایک اچھی خاصی جماعت میری ہمنوا ہوگئی۔

اس لئے ظاہر ہے کہ اس صورت میں حمایت احمدیت میں میرا کچھ لکھنا، نگار کے لئے باعث نقصان ہی ہوسکتا تھا نہ کہ نفع بخش کیونکہ اس طرح لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ میں مذہب کے باب میں رجعت پسند ہوگیا ہوں اور وہ نگار سے دست کش ہوجاتے۔ بنابراں یہ قیاس کرنا کہ یہ سب کچھ میں توسیع اشاعت نگار کے لئے کر رہا ہوں، کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ اب رہا یہ پہلو کہ اس سے مقصود یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح احمدی جماعت میں نگار کے زیادہ خریدار پیدا ہوجائیں گے سو یہ بھی نہایت کمزور پہلو ہے کیونکہ اول تو احمدی جماعت کو اس کی چنداں ضرورت ہی نہیں کہ میں یا کوئی اور ان کا پروپاگنڈا کرے دوسرے یہ کہ احمدی جماعت مشکل ہی سے باور کرسکتی ہے کہ میں کسی وقت احمدی ہوسکتا ہوں، کیونکہ جس حد تک عقاید کا تعلق ہے میرے ان کے درمیان کافی اختلاف ہے۔ رہی تیسری بات "رشوت عظیم" کی، سو اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں رشوت دینے کی ضرورت کیا ہے، جبکہ ان کے سارے کام بغیر رشوت ہی کے اچھی طرح چل رہے ہیں، دوسرے یہ کہ حقیقت کے لحاظ سے بھی یہ الزام بالکل غلط ہے اور میرا یہ کہنا غلط نہیں ہوسکتا کیونکہ بصورت دیگر کم از کم احمدی جماعت تو یقیناً سمجھ جاتی کہ میں کس قدر جھوٹا و لغو انسان ہوں کہ باوجود رشوت لینے کے میں اس سے انکار کر رہا ہوں اور میں ان کی نگاہ میں اپنے آپ کو ذلیل کرنا پسند نہ کرتا۔

بہرحال اس قسم کی بدگمانیوں کی پروا کئے بغیر میں یک بار پھر نہایت صداقت کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں تو ان کی عملی زندگی کا یقیناً مداح ہوں اور اگر میں بانی احمدیت کی تعریف کرتا ہوں تو اسی لئے کہ وہ مسلمانوں کو صحیح راستہ پر کھینچ لائے اور احساس اجتماعی کا وہ زبردست ولولہ اپنی جماعت میں پیدا کر گئے جس کی نظیر مسلمانوں کی کسی دوسری جماعت میں نہیں ملتی۔

رہا یہ مطالبہ کہ "میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس جماعت کے معتقدات پر گفتگو کروں"۔ سو اس مطالبہ پر مجھے سخت حیرت ہے کیونکہ جب تک پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ احمدی جماعت قرآن و حدیث کی تعلیمات سے منحرف ہے اس وقت تک قرآن و حدیث سے استدلال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو علی الرغم اس الزام کے یہ دیکھتا ہوں کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر عمل کرنے کا جو جذبہ ان میں پایا جاتا ہے وہ دوسری مسلم جماعتوں میں نظر ہی نہیں آتا۔

سب سے بڑا الزام جو اُن پر قایم کیا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ ختم نبوت کے قایل نہیں، حالانکہ اس سے زیادہ لغو و غلط بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ میرزا غلام احمد صاحب نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کو خاتم النبیین سمجھتے تھے بلکہ شریعت رسول کو بھی آخری شریعت تسلیم کرتے تھے۔ حیرت ہے کہ لوگوں کو ان کی طرف سے کیوں یہ غلط خیال قایم ہوگیا اور انکی تصنیفات کا مطالعہ کئے بغیر محض دوسروں کے کہنے پر کیوں یقین کر لیا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک بات ضرور بحث طلب ہے کہ مہدی موعود یا مثیل مسیح ہونے کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ کس حد تک قابل قبول ہے، سو میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا، کیونکہ اگر میں ان روایات کو درست نہ سمجھوں جو مہدی موعود اور ظہور دجال وغیرہ کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ تو بھی یہ حقیقت بدستور اپنی جگہ قایم رہتی ہے کہ میرزا صاحب نے اسلام کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور اصل چیز یہی ہے۔

جس حد تک عقاید کا تعلق ہے عامۃ المسلمین اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں خدا کی وحدانیت کے قایل ہیں، دونوں رسول اللہ کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں، دونوں قرآن کو خدا کا کلام جانتے ہیں، دونوں استناد بالحدیث پر عامل ہیں، دونوں بقاء روح، حیات بعد الموت، حشر و نشر، جزا و سزا، بہشت و دوزخ اور معجزہ وغیرہ کے قایل ہیں۔

اس لئے عام مسلمانوں کو تو ان کے خلاف کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ کیوں یہ مان لیں کہ میرزا صاحب مجدد تھے،

مہدی موعود تھے، مثیل مسیح تھے وغیرہ وغیرہ، سو اول تو مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اگر ہو بھی تو انکار کے لئے آپ کے پاس کوئی معقول وجہ موجود نہیں، سوا اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ: "ایسا یقین کرنے کو ہمارا جی نہیں چاہتا" برخلاف اس کے وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں متعدد روایات ایسی پیش کرتے ہیں جن کی صحت سے آپ کو بھی انکار نہیں۔ اور پھر اس کو بھی جانے دیجئے، خود میرزا صاحب کی زندگی اور ان کا کردار بجائے خود ان کے دعوے کا بڑا زبردست ثبوت ہے۔ مشکل تو میرے لئے ہے کہ میرے نزدیک خدا، رسول، قرآن، معجزہ، روح، معاد، وحی والہام وغیرہ تمام مسایل کا مفہوم کچھ اور ہے جو یقیناً احمدی وغیر احمدی دونوں جماعتوں سے بالکل علٰحدہ ہے۔ لیکن آپ باوجود اس کے کہ میرزا صاحب کو بُرا کہنے کی کوئی دلیل اپنے پاس نہیں رکھتے، اُن کے مخالف ہیں اور میں کہ ان کے بہت سے معتقدات کا اصولاً قایل نہیں، ان سے محبت کرتا ہوں، ان کی بڑی عظمت اپنے دل میں پاتا ہوں، میں ان کو بہت بڑا انسان سمجھتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ غالباً اس لئے کہ آپ حقیقت کو ڈھونڈھتے ہیں کتابوں میں، میں اس کی جستجو کرتا ہوں دلوں میں اور میرزا غلام احمد صاحب کے دل میں، میں نے اسی حقیقت کو جلوہ گر پایا۔

مجھے روایات میں نہ اُلجھایئے، ورنہ پھر میں وہی عقل ہرزہ کار کی باتیں شروع کردوں گا، جو ۴۰ سال کی کوشش کے بعد بھی نہ مجھے انسان بنا سکیں نہ کسی اور کو، حالانکہ میرزا صاحب نے اپنی بہت سی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں ہی سے نہ جانے کتنے حیوانوں کو انسان بنا دیا۔

"دلستان ما بین الخل والخمر"

---

(۲)

موضوعی اور معروضی

(اصطلاحات فلسفہ کی حیثیت سے)

میرے ایک عزیز دوست نے حال ہی میں، اپنی ایک تازہ تصنیف (جو ابھی تک شایع نہیں ہوئی ہے) مجھے بھیجی اور اسی کے ساتھ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اسے دور کردوں۔ خیر یہ تو ان کی محبت تھی کہ انھوں نے ایسا فرمایا، ورنہ یہ کتاب اپنی جگہ اتنی بلند تصنیف ہے کہ اس میں چون وچرا کی گنجایش ہی نہیں۔ لیکن اس میں مجھے ایک لفظ ایسا ضرور نظر آیا جو میرے لئے نیا تو نہ تھا (کیونکہ عہد حاضر کے اکثر ادیبوں اور نقادوں کی تحریروں میں بارہا میری نظر سے گزر چکا تھا) لیکن باوجود اس کے کہ میں اسے غلط سمجھتا ہوں میں نے اس پر کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔

ہو سکتا تھا کہ میں اب بھی اس سے بے خبرانہ گزر جاتا، لیکن چونکہ یہ تصنیف میرے ایک ایسے عزیز دوست کی ہے جن سے مجھے بہت محبت ہے، اس لئے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اس غلطی کی طرف ان کو متوجہ نہ کروں۔ چنانچہ میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ اس لفظ کا استعمال انھوں نے کس مفہوم میں کیا ہے۔

انھوں نے جو جواب دیا ہے اس کے سننے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ وہ لفظ بھی سن لیں — یہ لفظ معروضی ہے جو آج کل اُردو میں فلسفہ کی اصطلاح "Objective" کی جگہ استعمال کیا جا رہا ہے اور جس کی تصدیق خود انھوں نے بھی اپنے خط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"فلسفہ کی دو اصطلاحیں ہیں۔ Subject اور Object اُردو میں ان کے لئے موضوع اور

معروضی استعمال کئے جاتے ہیں - چنانچہ objective اور objectively کے لئے "معروضی"
اور objectivity کے لئے "معروضیت" اور "objective point of view"
کے لئے "معروضی نقطۂ نظر" ڈاکٹر عابد حسین کی تحریروں میں، میں نے بارہا پڑھا ہے"۔

اس جواب سے ظاہر ہے کہ فاضل مصنف نے محض ڈاکٹر عابد حسین کی تحریر پر اعتماد کرلیا اور خود کوئی تحقیق نہیں کی کہ یہ ترجمے اپنی جگہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔

انگریزی میں subject اور object متعدد معانی میں مستعمل ہیں۔

subject کا مفہوم منطق میں وہی ہے جسے عربی میں المسند الیہ اور المحمول علیہ کہتے ہیں، یعنی کسی قضیہ (Proposition) کا وہ پہلو جس کے پیش نظر کسی چیز کا انکار یا اقرار کیا جائے۔

فلسفہ میں اس کا مفہوم ہے :-

Mind regarded as thinking power.

جس کا ترجمہ ہم "نفسِ مفکرہ" کرسکتے ہیں۔

object کا مفہوم فلسفہ میں ہے :-

Something presented to the senses
or mind to excite emotion affection or passion

یعنی وہ چیز جو نفس یا احساس میں کسی جذبہ کی تحریک کا باعث ہو جسے ہم نفس کے مقابلہ میں مختصراً "مادہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اب subjective اور objective کی فلسفیانہ اصطلاحات کو لیجئے، جو قریب قریب یہی مفہوم رکھتی ہیں :-

Subjective :

Anepithet applied to those internal states
of thought or feeling of which the mind is subject.

یعنی سبجکٹیو سے مراد وہ خیال و تاثر ہے جو نفس یا ضمیر کے احساس سے متعلق ہو۔

Objective :

which is applied to things considered
separate from the mind.

یعنی کوئی چیز نفس سے جدا ہے۔

اس صراحت سے مقصود صرف یہ تھا کہ پہلے ان الفاظ کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرلیا جائے اور پھر ان کے ترجمہ پر غور کیا جائے۔

موضوعی اور معروضی دونوں ترجموں کی ساخت عربی ہے، لیکن خود عربی زبان ان ترجموں سے خالی ہے۔

سبجکٹیو کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے :- شخصی، ذاتی، داخلی، باطنی یا ذہنی (موضوعی نہیں) اور آبجکٹیو کا ترجمہ انھوں نے ظاہری، خارجی یا عَرَضی کیا ہے (معروضی نہیں) - لیکن اس کے برخلاف ہمارے ادیبوں نے وہی دو لفظ (موضوعی اور معروضی) پسند کرلئے جو عربی میں ترک کردئے گئے تھے، اور جن میں اول الذکر بھی گویا زیادہ صحیح نہیں، لیکن دوسرا (معروضی) تو یقیناً بالکل غلط ہے۔

چونکہ لفظ سبجکٹ، انگریزی میں موضوع گفتو یا عنوان بحث کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس لئے سبجکٹیو کا ترجمہ اُردو میں موضوعی کر دیا گیا، حالانکہ عربی میں موضوع جس معنی میں مستعمل ہے اس کا فلسفہ کی اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں، لیکن خیر، اسے برداشت کیا جا سکتا ہے کیونکہ موضوع غلط لفظ نہیں ہے اور عربی میں مستعمل ہے گو فلسفہ کی اصطلاح کی حیثیت سے نہیں لیکن معروضی کی صورت بالکل دوسری ہے۔

عربی میں لفظ عرض مختلف حرکات کے ساتھ مختلف معانی میں مستعمل ہے، اور اس سے متعدد مصادر (مثلاً اعراض، تعرض، تعارض، تعریض، استعراض، معارضہ وغیرہ) کا اشتقاق ہوتا ہے، لیکن یہاں عرض کے تمام معانی بیان کی ضرورت نہیں، صرف ایک کا اظہار کافی ہے جس کا تعلق اصطلاح فلسفہ سے ہے۔

فلسفہ میں جوہر اور عَرَض دو چیزیں بالکل علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ جوہر وہ جو بالذات قایم ہو اور عَرَض وہ جو بالذات قایم نہ ہو، جیسے سُرخی، سیاہی، سپیدی وغیرہ کہ ہم ان کو کسی وساطت ہی سے دیکھ سکتے ہیں، علٰحدہ ان کا کوئی وجود نہیں۔ اسی لئے عربی میں آبجکٹیو کا ترجمہ خارجی وظاہری کے علاوہ عَرَضی بھی کرتے ہیں (عین اور را دونوں مفتوح)

میں سمجھتا ہوں کہ اس غلطی کی بنیاد انجمن ترقی اُردو کا وہ لغت ہے جو آکسفورڈ ڈکشنری کے ترجمہ کے نام سے شایع ہوا ہے، کیونکہ اس میں ان دونوں اصطلاحوں کا ترجمہ داخلی وخارجی کے علاوہ موضوعی ومعروضی بھی درج ہے اور اسی کی تقلید میں ہمارے ادیبوں نے ان کا استعمال شروع کر دیا، شاید اس لئے کہ وہ زیادہ شاندار اور مرعوب کن ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عَرْض (بہ سکون را) کے معنی پیش کرنا اور سامنے لانا بھی ہے اور اسی لئے جدید عربی میں درخواست یا عرضداشت کو معروض کہنے لگے، لیکن اصطلاح فلسفہ کی اصطلاح کا تعلق عَرْض سے نہیں بلکہ عَرَض سے ہے اور اس سے معروض (صیغۂ مفعول) نہیں بن سکتا۔

میری رائے میں ان دونوں اصطلاحوں کا ترجمہ داخلی وخارجی زیادہ مناسب ہے، کیونکہ وہ اصل مفہوم سے قریب تر ہیں، ہلکے ہیں اور اُردو میں رائج بھی ہو چکے ہیں۔

---

(۴)

جناب شاغل جے پوری اور زیب دہلوی

۲۰ اکتوبر کو جے پور سے جناب رام چندر کھتری کا ایک خط مجھے ملا، جس سے معلوم ہوا کہ منور حسین خاں صاحب زیب دہلوی (جو وہاں سکریٹریٹ سے وابستہ تھے اور اب ریٹائر ہونے والے ہیں) اور مولانا شاغل جے پوری کے درمیان کچھ عرصہ سے اختلاف چلا آرہا ہے اور اس اختلاف نے اب بڑی مضحک وناگوار صورت اختیار کر لی ہے۔

رام چندر صاحب نے اس اختلاف کا سبب یہ ظاہر کیا ہے کہ جناب زیب یہ چاہتے ہیں کہ مولانا شاغل کو جو انجمن ترقی اُردو جے پور کے سکریٹری، علٰحدہ کر کے خود انکی جگہ لے لیں اور اس مقصد برآری کے لئے وہ مختلف تدابیر سے کام لے رہے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ زیب صاحب نے جناب شاغل کے اس شعر کو سامنے رکھ کر

طلب ہے کفر، طلب کا ہو کیوں خیال مجھے
کہ دو جہان دئے اس نے بے سوال مجھے

ان کو نوٹس دیا کہ :-

"تم یہ شعر کہکر گناہ کے مرتکب ہوئے ہو، کیونکہ اس شعر میں طلب کا تعلق خدا سے ہے اور خدا سے طلب کرنے کو کفر کہنا ناجایز ہے۔ اگر تم نے اندر میعاد علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا تو میں وہ تمام فتاویٰ جو اس سلسلہ میں میری تحویل میں ہیں شایع کر دوں گا۔ علاوہ اس کے چونکہ تم نے یہ شعر مجمع عام میں پڑھا تھا اور اس سے میرے مذہب و عقاید کی تنقیص ہوئی اور میرے جذبات ایمانی مجروح ہوئے اس لئے مجھ کو دنیاوی قانون کے تحت یعنی تعزیرات کی دفعہ ۲۹۵، الف کے تحت کارروائی کا حق حاصل تھا لیکن دنیاوی جزا سزا سے عاقبت کسی کی درست نہیں ہوتی اس لئے بطور اتمام حجت شرعی میں نے براہ راست تم کو پہلے مخاطب کرنا ہی مستحسن سمجھا۔"

رام چندر صاحب نے اپنے خط کے ساتھ اس نوٹس کی پوری نقل بھیجدی ہے اور اس جواب کی بھی جو زیب صاحب کو دیا گیا ہے اور مجھ سے دریافت کیا گیا ہے کہ :-

۱- کیا طلب کے معنی صرف دعا کے ہیں اور طلب از مخلوق کے نہیں۔
۲- کیا زیب صاحب کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ غزل میں ایسا شعر کہنا گناہ یا کفر ہے۔
۳- زیب صاحب کی فتویٰ طلبی جناب والا کے نزدیک کس قابل ہے۔

ادبی یا علمی حیثیت سے یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ میں نگار میں اس پر گفتگو کرتا، لیکن چونکہ (حسب بیان رام چندر صاحب) اس اختلاف کی وجہ سے جے پور کی ادبی فضا خراب ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اس جھگڑے میں اردو کو نقصان پہونچ جائے، اس لئے اس پر اظہار خیال ضروری ہے۔

جس حد تک شعر کے مفہوم اور لفظ طلب کے استعمال کا سوال ہے، زیب صاحب کا یہ کہنا کہ وہ منجر بہ کفر و معصیت ہے اس قدر مضحک بات ہے کہ اس کو سن کر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ واقعی زیب صاحب نے ایسا کہا ہوگا اور ان کی برافروختگی مذہبی استفتاء کی حد تک پہونچ گئی ہوگی۔ یہ ایسی طفلانہ حرکت ہے جو یقیناً جناب زیب، کو زیب نہیں دیتی۔

اس شعر میں طلب کا تعلق خدا ہی سے ہے اور شاعر نے اسی طلب کو کفر قرار دیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو ہین مذہب کا اس سے کیا تعلق ہے اور شعر کو دارالافتاء یا کسی درسگاہ مذہب تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔

شاعروں نے موسیٰ، عیسیٰ، یوسف، خضر و الیاس بلکہ کعبہ تک پر طعن زنی کی ہے اور ہمیشہ ایسے اشعار کو سراہا گیا ہے کیونکہ ان شعروں کا مفہوم درحقیقت کچھ اور ہوتا ہے، چہ جائیکہ شاغل صاحب کا یہ شعر کہ اس میں تو خدا کے انتہائی فضل و کرم کا اظہار کیا گیا ہے کہ جب اس نے بے سوال دونوں جہاں مجھے دیدئے تو پھر کیوں اس سے کوئی اور چیز طلب کروں اور اگر میں ایسا کروں تو یہ بڑا کفران نعمت ہوگا۔

زیب صاحب کو میں جانتا ہوں مگر صرف اس قدر کہ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں اور ان کے خاندان کے بعض افراد سے جو اب پاکستان میں ہیں، میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ وہ شعر اچھا کہتے ہیں، اور عرصہ ہوا ان کی ایک نظم بھی نگار میں شایع ہو چکی ہے۔

پچھلے سال انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ خدمت اردو کے لئے جے پور میں کوئی انجمن قایم کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اس انجمن کی سرپرستی کی درخواست کی تھی، لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا تھا، اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے اور میں بھی ان کی

طرف سے بالکل بے خبر رہا۔ اب اتنے دنوں کے بعد رام چندر صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جناب زیب بدستور جے پور ہی میں ہیں اور اُردو ادب سے زیادہ، اب ان کو مذہب سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور یہ دلچسپی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وہ شعر کے حسن و قبح کو بھی مذہبی جواز و عدم جواز کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ زیب جیسے پڑھے لکھے انسان میں یہ رجعت کیوں پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ تاہم حقیقت جو کچھ بھی ہو۔

میں، جناب زیب سے درخواست کروں گا کہ وہ راجستھان میں کوئی ایسی فضا پیدا نہ ہونے دیں جو انجمن ترقی اُردو یا زبان کے لئے نقصان رساں ہو۔ اگر وہ زبان کی خدمت کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو شوق سے آگے بڑھیں اور بزم اُردو میں تشریف لائیں مگر اس طرح نہیں کہ لوگوں کو یہ کہنا پڑے کہ :-

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں !

چچا کا کہنا مانو
"ابھی تم جوان ہو، جب میں تمہاری عمر کا تھا تو من بھر بوجھ اُٹھاتا تھا اور تھکتا نہیں تھا۔ میری مانو اور ہمدرد کا تیار کردہ ٹانک سنکارا استعمال کیا کرو۔ یہ یونانی طریقے پر طاقت بخش جڑی بوٹیوں سے جن میں وٹامن ہوتے ہیں تیار کیا گیا ہے۔ سنکارا مہنگا ٹانک نہیں ہے۔ اس کا مزہ نہایت خوشگوار ہے۔ روزانہ کھانے کے ساتھ یا دن بھر کی محنت کے بعد اسے پیو، ویسے ہی جوان اور پھرتیلے بنے رہو گے۔"
"تندرستی کے اُصول"
یہ کتابچہ مفت حاصل کرنے کے لئے اپنا نام اور پتہ اس اشتہار کے تراشے کے ساتھ ہمدرد دواخانہ دہلی نمبر ۶ کو روانہ کیجئے۔
سنکارا
دہلی • کانپور • پٹنہ
ہمدرد
maa HMD. 52 UR

قتل شیر افگن

اور

معاشقۂ جہانگیر و نور جہاں

(تاریخ کی صحیح روشنی میں)

(ز-زبیری)

شیر افگن کے قتل کا واقعہ جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ یوں بتایا جاتا ہے کہ سلیم، مہرالنساء سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ اکبر نے انکار کر دیا تھا، اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیر افگن سے کر دی تھی اس لئے سلیم نے اسے قتل کرا دیا۔

کینیڈی (Kennedy) لکھتا ہے :-

"جہانگیر تخت نشین ہوتے ہی صوبہ دار کو ہدایت بھیجتا ہے کہ مہرالنساء کو شیر افگن سے طلاق دلوا دے، اور اس کو (مہرالنساء) دربار میں بھیجدو، لیکن شوہر (شیر افگن) نے اعتراض کیا، اور اس کا یہ اعتراض جایز تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے پیٹ میں چھری بھونک دی اور خود بھی چھری بھونک کر مر گیا۔ اب مہرالنساء دربار میں بھیجدی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اس کا یہ خیال حق بجانب تھا"[1]

الفنسٹن (Elphinston) بھی تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے۔

ہولڈن (Holdan) لکھتا ہے کہ :-

"جہانگیر، قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ وہ شیر افگن کو مجبور کرے کہ مہرالنساء کو طلاق دیدے اور اس کو گورنر کے حوالہ کر دے تاکہ وہ دربار میں بھیجدی جائے"[2] لیکن پھر خود ہی ہولڈن کہتا ہے کہ :- "لیکن ان تمام باتوں کی کوئی تفصیل معلوم نہیں"[3]

سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) نے نور جہاں کے اقتدار اور جہانگیر پر اس کے اثر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن شیر افگن کے قتل کے متعلق اس نے ایک لفظ نہیں لکھا[4]

ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) جس نے ۱۶۱۶ء سے ۱۶۱۹ء یعنی مسلسل تین سال تک ہندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ اپنے سفرنامہ میں ہندوستان کے متعلق وہ سب کچھ لکھتا ہے جو ایک سفرنامہ میں ہونا چاہئے۔ اس نے یہاں کے لوگوں

---

[1] ڈوڈ (Dow) صفحہ ۲۴ و ۲۵ —— [2] کینیڈی، جلد دوم، صفحہ ۱ —— [3] تاریخ ہندوستان از ہولڈن (Holdan) صفحہ ۴۴

[4] جہانگیر، از پروفیسر بینی پرشاد، صفحہ ۱۲۲

کے عادات، واطوار، امراء کے لباس، حکومت کی دفتری زبان، ہندوستانی آبادی، صدقہ کے متعلق نہایت تفصیل سے بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن اُس سے ایک لفظ بھی اس افسانہ کے متعلق نہیں لکھا۔ حالانکہ صرف پانچ برس قبل یعنی ۱۶۱۱ء میں جہانگیر اور مہرالنساء کی شادی ہوئی تھی۔ وہ صرف اتنا لکھتا ہے :۔

"نورمحل، جہانگیر کی محبوب ترین ملکہ تھی، اس نے اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بہتوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا"[1]

اس سیاح نے شیر افگن کے قتل یا طلاق کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کیا۔

شیر افگن کے قتل کی حقیقت اقبال نامۂ جہانگیری کی رُو سے یہ تھی :۔

"شیر افگن، بنگال کا جاگیردار تھا، شاہ اسماعیل صفوی کی وفات کے بعد علی قلی خاں قندھار کے راستہ سے ہندوستان آتا ہے اور خانخاناں کے دربار میں رسائی پیدا کرتا ہے، رفتہ رفتہ دربار شاہی میں رسوخ ہوتا ہے۔ جہانگیر "شیر افگن" کا خطاب دیتا ہے اور بنگال میں جاگیر دے کر سرفراز کرتا ہے، یہاں یہ نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ۱۶۱۱ء میں بنگال میں افغانوں کی بغاوت زیر سرکردگی عثمان خاں شروع ہوتی ہے"[2]

جینی پرشاد اپنی کتاب جہانگیر میں لکھتے ہیں :۔

"اس وقت بنگال میں بغاوت و سازش کا بازار نہایت گرم تھا، افغان سرکشی اور شرارت پر اُتر آئے تھے (جہانگیر) کو شبہ ہوتا ہے کہ شیر افگن بھی باغیوں کے ساتھ شریک ہے"[3]

ظاہر ہے کہ یہ شبہ جہانگیر کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا کہ وہ جس کو اُس نے جاگیر و خطاب دیا ہو، عزت بخشی ہو، سرپرستی کا ذمہ لیا ہو، خود اُس سے باغی ہو جائے !!

جیمس برگس (James Burguss .) لکھتا ہے :۔

"۱۲ اکتوبر ۱۶۱۲ء کو قطب الدین، بنگال بشمول بہار کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے، اُس کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ شیر افگن علی قلی استجلو، مہرالنساء کے شوہر کو دربار میں بھیجدے۔ شیر افگن نے جانے سے انکار کرتا ہے، آخرکار آپس کی ایک جھڑپ میں ایک دوسرے کی جان جاتی ہے"[4]

معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اس شبہ پر کہ شیر افگن باغیوں سے ملا ہوا ہے۔ اس کا بنگال میں رہنے دینا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے اس کو بلواتا ہے۔ اقبال نامہ جہانگیری کے بیان سے (James Burguss .) (جیمس برگس) کے بیان پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ قطب الدین بنگال کیوں بھیجا گیا ؟ شیر افگن کی طلبی کی وجہ کیا تھی ؟ شیر افگن کی ہندوستان میں آمد، اکبر کے دربار میں رسائی، جہانگیر کا اس کو خطاب اور جاگیر کا دینا، بیان کرتے ہوئے مصنف اقبال نامہ لکھتا ہے :۔

"مگر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کا خمیر فتنہ، بوئی اور شورش پسندی سے مرکب ہے"[5]

قطب الدین، بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوتا ہے، جاتے وقت جہانگیر ہدایت کرتا ہے :۔

"اگر وہ (شیر افگن) راست کرداری پر قایم رہے، تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، ورنہ ہمارے پاس بھیجدیا جائے، اور اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے"[6]

قطب الدین، بنگال پہونچ کر شیر افگن کو طلب کرتا ہے، وہ حاضری سے انکار کر دیتا ہے، قطب الدین کو اُس کی اس حرکت سے "شبہ"

---

[1] (Early travel by Foster .) صفحہ ۲۲۹

[2] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۶ و ۱۷۔ تاریخ ہند مولانا ذکاء اللہ جلد ششم صفحہ ۵۸۔ [3] جہانگیر صفحہ ۱۳۔ [4] اقبال نامہ صفحہ ۱۷۔ [5] ایضاً۔ [6] ایضاً

ہوتا ہے، اس کی اطلاع دربار میں کی جاتی ہے، جہانگیر کا دوبارہ حکم آتا ہے :۔

"اُس کو روانہ کریں اور اگر اس کے اطوار سے بد اندیشی کا اندیشہ کا اندازہ کریں۔ تو جس طرح رخصت ہوتے وقت ہدایت ہوئی تھی، اُس ناہنجار کو سزا دیں"[1]

قطب الدین دوسرا حکمنامہ پاتے ہی شیر افگن کے یہاں خود جاتا ہے تاکہ اُس کو "گرفتار" کرے۔ گورنر کی آمد کی خبر سُن کر شیر افگن دو جلادوں کی معیت میں آتا ہے، موقع پاکر قطب الدین کے پیٹ میں تلوار بھونک دیتا ہے، قطب الدین لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے منیر خاں کاشمیری آتا ہے، شیر افگن پر وار کرتا ہے، اور خود غریب کاشمیری ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس عرصہ میں قطب الدین کے آدمی موقع پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور شیر افگن کو اُس کے کئے کی سزا دیتے ہیں[2]۔

جہانگیر کو جب قطب الدین کے مارے جانے کی خبر ملتی ہے تو وہ شیر افگن کو اس طرح یاد کرتا ہے :۔

"مردم ہجوم آوردہ او را پارہ پارہ ساختند و بجہنم فرستادند امید ہمیشہ در جہنم جائے آں بدبخت روسیاہ بودہ باشد"[3]

یہ ہے شیر افگن کی قتل کی ساری داستان! باغی اور سرکش کی سزا ہمیشہ قتل و پھانسی ہوا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ شیر افگن کے متعلق خود جہانگیر اور گورنر دونوں کو "صرف شبہ" تھا، اس لئے جہانگیر، قطب الدین کو تاکید کرتا ہے :۔

(۱) اگر خیر خواہی و راست کرداری پر قایم رہے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

پھر تاکیداً کہدیتا ہے اگر ایسا نہ کرے۔

(۲) تو ہمارے پاس بھیجدیا جائے۔

پھر حکم دیتا ہے :

(۳) اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے۔

بلاشبہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ شیر افگن قتل ہوا، لیکن کیوں اور کس لئے؟۔ بغاوت و سرکشی، فتنہ و فساد، سازش و ریشہ دوانی اور سب سے بڑھکر شہنشاہ کے حکم کی نافرمانی، شیر افگن کا سب سے بڑا جُرم تھا۔

اب میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جہانگیر نے نورجہاں کو شیر افگن کے قتل سے پہلے دیکھا ہی نہ تھا، جیسا کہ :۔ Petro Della Vella. (پیٹرو ڈیلا ویلا) نے لکھا ہے۔

نورجہاں، شیر افگن کے قتل کے بعد دربار بھیجدی جاتی ہے۔ جہانگیر اس کو اپنی سوتیلی ماں رقیہ سلطانہ کے سپرد کر دیتا ہے[4]۔

پروفیسر بنی پرشاد لکھتے ہیں :۔

"ایک مدت تک یہ لڑکی (مہرالنساء) رقیہ سلطانہ کے پاس آرام و کس مپرسی کے ساتھ بسر کرتی رہی، ایک دن جشن نوروز میں جہاں پناہ کی منظور نظر ہوئی۔ پرستاران حرم سرائے کے گروہ میں شامل ہوکر، عزت و مراتب ارتقاء میں عروج حاصل کرتی ہوئی، علوئے منصب کے آخری منزل پر پہونچ گئی پہلے "نورمحل" نام رکھا گیا، پھر چند روز بعد

---

[1] اقبال نامہ، صفحہ ۱۶ و ۱۷

[2] ایضاً صفحہ ۵۲

[3] مہرالنساء اور اس کی لونڈیوں کے لئے روزینہ خرچ کے لئے ۳ ہزار مقرر کیا جاتا ہے، تاریخ ہندوستان؛ (History of India by Dow.) صفحہ

"نورجہاں" کا خطاب عطا ہوا۔[۲-۱]

عشق، ماں، باپ، بھائی، بہن، عزیز و اقارب کی محبت سے کہیں بلند و بالا ہوا کرتا ہے۔ اگر واقعی (جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں) سلیم کو مہرالنساء سے محبت ہوگئی تھی اور یہ دیوانگی و عشق کا اثر تھا کہ وہ مہرالنساء کو ہر جایز و ناجایز طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تو جہانگیر کا یہ عشق اس وقت سے شروع ہوا ہوگا جب وہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد مستقلاً دربار میں آکر رہنے لگی تھی۔ اس وقت تک جہانگیر و نورجہاں کی ملاقات اور شیر افگن کے قتل کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس سے پوری طرح یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلیم نے مہرالنساء کو جب بھی اور جہاں کہیں بھی دیکھا ہو یہ عشق نگاہ اولیں کا عشق نہ تھا، اور شیر افگن اگر قتل ہوا تو اس لئے نہیں کہ بدقسمتی سے وہ مہرالنساء کا شوہر تھا بلکہ وہ مجرم تھا اور مجرم کی سزا جو ہونی چاہئے تھی وہ اس کو ملی۔

---

[۱] اقبال نامہ جہانگیر، صفحہ ۱۵ و ۱۶

[۲] ۱۶۱۱ء میں نورمحل و مارچ ۱۶۱۶ء میں نورجہاں - جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد

نیا ادبی لٹریچر

ہندوستانی نسانیات کا خاکہ	سید احتشام حسین	۲	۸
ساحل اور سمندر (سفرنامہ)	" "	للعہ	۸
چھان بین - تنقیدی مقالات	آثر لکھنوی	۳	۸
اُردو میں رومانوی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	۲	۸
آتش گل	جگر مرادآبادی	۲	
ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	۲	
تنقیدی شعور	سید اختر علی تلہری	۲	۸
فسانۂ عبرت مصنفہ رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب		۲	۸
فرہنگ امثال	" "	۲	۸
بیگمات اودھ	تصدق حسین	۲	۸

اُردو تنقید پر ایک نظر	پروفیسر کلیم الدین احمد	۵
نقش حالی - حصہ اول		۵
نقش حالی - حصہ دوم		۲
نقوش افکار	مجنوں گورکھپوری	۲
ذوق ادب و شعور	احتشام حسین	۲
روایت اور بغاوت	"	للعہ
تنقیدی جایزے	"	۲
تنقیدی نظریات	"	۵
ادب و نظر	آل احمد سرور	للعہ
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	للعہ

منیجر نگار لکھنؤ

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ سالنامے پڑھئے

ارمغان سخن نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول - حسرت نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول - مومن نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول -
ریاض نمبر: قیمت دو روپیہ علاوہ محصول - داغ نمبر: قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول -
لیکن یہ سب آپ کو بیس روپیہ میں معہ محصول مل سکتے ہیں، اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں - (جملہ ۲۵ صفحے)

منیجر نگار لکھنؤ

نیاز کو بوجہل و بولہب کہنے والوں سے

(گوہر)

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے
تو پھر یہ دشمنیِ عقل و ہوش کیا معنی
یہ شور کافر و زندیق و ملحد و بے دین
برائے گوش صداقت نیوش کیا معنی
سوال "وحی" پہ آخر پہ برہمی کیسی
مثالِ "نحل" پہ جوش و خروش کیا معنی
اگر "جمودِ روایات" ہے "جوابِ خرد"
تو پھر یہ شورشِ محشر بدوش کیا معنی،
"مقامِ دین" کو عقل و خرد سے کیا "نسبت"
یہ ادعا بزبان خموش کیا معنی
"بغیر نطق جو ممکن ہے گفتگو و پیام"
تو پھر وساطتِ پیکِ سروش کیا معنی
جوابِ میکدۂ غور و فکر بازنہیں
تو دعوتِ نظر و وہم کوش کیا معنی
کلام و فلسفہ مانا خرد کے دھوکے ہیں
مگر یہ "جہل کا جوش و خروش" کیا معنی

بنامِ حق و صداقت فریبِ فہم نہ دے
یقیں کے نام سے ہم کو پیامِ وہم نہ دے

"نگاہِ فکر" کو عصیاں طلب نہیں کہتے
تلاشِ حق کو "تبِ بے سبب" نہیں کہتے
"توہماتِ جنوں" پر دۂ "دلیل" نہیں
حجابِ عقل کو درسِ ادب نہیں کہتے
"یقینِ غیب" پہ تسکین کا مدار سہی
ہر ایک شکل تو ہم کو رب نہیں کہتے
محمدِ عربی کو جو مانتا ہو "نبی"
عزیزِ دوست! اسے بولہب نہیں کہتے

فضائے چرخ کو تو بندشِ نظر نہ سمجھ
اسے نہایتِ پرواز بال و پر نہ سمجھ
طلوعِ صبحِ قیامت ہے انتہا تیری
فسانۂ غمِ تحقیق مختصر نہ سمجھ
جمالِ قدس پہ جس کی نگاہ رہتی ہو
اُسے جہانِ تماشا میں بے بصر نہ سمجھ
رسول کو جو امامِ زماں سمجھتا ہو
اُسے مقامِ رسالت سے بے خبر نہ سمجھ

نیاز عظمت و شانِ پیمبری داند
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پلین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائلن
نول

کپڑا
سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا
اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پاتامہ
پرشیا

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹیڈ جی۔ٹی روڈ۔امرتسر

تار کا پتہ: "رین" (Rayon)

ٹیلی فون 2562

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹیڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

فلسفی یا پاگل

(مجتبیٰ حسین)

مگر نہ اسے ہم فلسفی کہہ سکتے تھے نہ پاگل ۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے اس سلسلہ کی درمیانی کڑی تصور کر لیجئے۔ کچھ خبطی وہ ضرور تھا، ورنہ اس زمانہ میں چار سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری چھوڑ کر ہرگز گھر نہ بیٹھ رہتا۔ وہ کچھ فلسفی بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کی علمیت بے انتہا خشک تھی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھا بلکہ درمیانی نقطہ بھی نہ تھا اس لئے کہ بعض اوقات نہ وہ پاگل ہی معلوم ہوتا نہ فلسفی، یوں سمجھئے کہ لفظ 'عجیب' کا اگر صحیح اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو یہی شخص تھا۔ زندگی کا ایک طنزیہ زندگی پر ایک طنز جو بہتر سمجھئے کہ لیجئے۔

اتنے بڑے شہر میں تنہا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز! ایسی ہولناک زندگی گزارنا اسی کے بس کی بات تھی۔ لوگ اسے علاوہ خبطی، پاگل اور سڑی کے مغرور بھی کہتے تھے اور حق بجانب بھی تھے کیونکہ وہ بہت کم لوگوں سے سیدھے منہ بات کرتا۔ میرا مکان اسکے پاس ہی تھا، میں کبھی کبھی وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا:۔ "کیوں جناب دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے ایک مرتبہ یوں ہی پوچھ لیا تھا کہ "کیا آپ اخبار بھی نہیں پڑھتے؟"۔ اس کا جواب وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دیدیا کرتا تھا۔

جب سے پروفیسری چھوڑی اس شخص نے نہ کوئی اخبار منگایا نہ لوگوں کے حالات سننے کی کوشش کی۔ کتابوں سے اسے نفرت تھی۔ کہا کرتا تھا "انسان اپنی ذہنی تنہائیوں سے بچنے کے لئے کتابیں لکھتا ہے"۔ کتابیں اس کے یہاں بہت تھیں، لیکن سب کی سب گرد آلود۔

مجھے ادبیات، خصوصاً شعر سے فطری دلچسپی تھی، اسی لئے پروفیسر صاحب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ ان کی زندگی پر کبھی کبھی ایک تلخ شعر کا گمان ہو جاتا تھا۔ جب کبھی میں ان سے کسی شاعر کا تذکرہ کرتا وہ نہایت خشک لہجہ میں فرمادیا کرتے:۔ "بھئی شاعروں کی بات چھوڑو، شاعر، اخبار اور کتابیں، یہی تین چیزیں تو ہیں جو دُنیا کو خراب کرتی ہیں"۔ میں اگر زیادہ اصرار کرتا تو وہ صاف کہدیتے "جناب جایئے کوئی کام کیجئے اور دوسروں کو کام کرنے دیجئے"۔ گویا انھیں بڑا کام ہی رہتا ہے ۔۔ دن بھر بیٹھے رہنا۔ سگریٹ پینا اور شام کو کسی دیرانہ میں نکل جانا ۔۔۔ یہ تھا ان کا کام!

ان کی کوئی ایسی زیادہ عمر بھی نہ تھی کہ کہا جا سکتا کہ شاعری سے اب انھیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ صرف چالیس سال کی عمر تھی اور سچ پوچھئے تو اس سن میں لوگ شاعر بنتے ہیں۔ بہر حال میں بھی موقع کا منتظر رہتا، اور باوجود ان کی طنز و برہمی کے ایک آدھ شعر ضرور سنا دیتا اور وہ خاموش منہ بنائے بیٹھے رہتے۔

انھیں دنوں مجھے ایک نوجوان شاعر جمال کے کلام سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ جمال کا رنگ یکسر عاشقانہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے اشعار پروفیسر صاحب کے جمود اور بے حسی کو توڑ دیں گے مگر وہ شخص کبھی نہ پسیجا۔ کبھی کبھی سن لیتے یہی غنیمت تھا۔ جب زیادہ تنگ آجاتے تو ٹہلنے لگتے اسی درمیان میں، میں نے جمال سے بھی دوستی پیدا کر لی تھی۔ ہم عمر اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی

"شعریت" کا جامہ ہوتی تھی۔

ایک دن جمال کو لے کر پروفیسر صاحب کے یہاں پہونچا۔ نو بجے رات کا وقت تھا۔ پروفیسر صاحب کے مکان میں اندھیرا تھا۔ صرف دو کمروں میں روشنی تھی، ایک تو وہ جہاں خود تشریف فرما تھے، دوسرے جہاں کھانا پک رہا تھا۔ پروفیسر صاحب آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے نظریں چھت پر جمائے سگریٹ پی رہے تھے۔ سامنے گول میز پر لیمپ ہلکا ہلکا جل رہا تھا۔ کمرہ میں خاموشی طاری تھی اور کچھ وحشت سی برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آدمی رہتے ہی نہیں۔ ہم لوگ بیٹھ گئے مگر وہ چپ چاپ جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔

جمال کو سخت مایوسی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی، اس نے کئی مرتبہ میرا ہاتھ دبایا کہ چلو، مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ "ذرا ٹھیرو!"۔ دو تین منٹ کے بعد پروفیسر صاحب اپنے آپ میں آئے۔

"کہئے دنیا میں کیا ہو رہا ہے"۔

میں نے کہا :۔ "ہر شخص خوش و خرم ہے بلکہ اور زیادہ مسرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

کہنے لگے :۔ "کیوں جناب یہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟"

"یہ تو فطری خواہش ہے"۔

"اور یہی فطری خواہش، یہی بے قراری، کبھی مسرت نہ حاصل کرنے دے گی انسانی زندگی سے یہ 'نامکمل کا احساس، کبھی نہ مٹے گا"۔

"خیر ہوگا۔ آپ کو جمال سے ملاؤں"۔

"وہی آپ کے محبوب شاعر؟"

"ہاں"

نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھے نہ جمال۔ میں دل ہی دل میں بے انتہا شرمندہ ہو رہا تھا۔ گو یہ جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب کم سخن وحشی، خبطی اور بد دماغ ہیں لیکن اس حد تک ان کو گیا گزرا نہ سمجھتا تھا۔

آج بے حد مایوسی ہوئی۔ میں جمال سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا، لاکھ چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب کی اس بدتہذیبی اور بے رُخی کو کس طرح جمال کے سامنے ہلکا کر کے پیش کروں، مگر کوئی تاویل ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی، آخر کار میں نے کہا "اچھا تو اب اجازت دیجئے"۔ "بصد شوق" انھوں نے کہا اور پھر چھت پر نظریں جما دیں گویا اوپر مکڑی کے جالوں میں کوئی خاص دلکشی تھی۔

میں خاموشی سے اٹھا اور جمال کو لے کر باہر چلا آیا یہاں آکر میں نے کھلی ہوا میں فراغت کی سانس لی۔ جمال چپ تھا، میں نے کہا:۔ "بھئی معاف کرنا، بہر حال زندگی کی ایک تصویر تم نے یہ بھی دیکھ لی" اس کے بعد میں دو ہفتے تک پروفیسر صاحب کے یہاں نہیں گیا۔ اس دن وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے عزم کر لیا تھا کہ اب ان کے ہاں کبھی نہ جاؤں گا مگر جوں جوں دن گزرتے گئے میرا عزم متزلزل ہوتا گیا۔ جمال سے مجھے بے انتہا محبت تھی اور اس سے زیادہ اس کے اشعار سے مگر پھر بھی پروفیسر صاحب کی محبت اور ان کی بہکی بہکی باتوں میں کچھ کم لطف نہ آتا تھا۔

تیسرا ہفتہ قریب ختم تھا کہ پروفیسر صاحب میرے عزم پر غالب آگئے اور میں ان کے یہاں پہونچ گیا، وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے، میں نے پہونچتے ہی کہا:۔

"دنیا بدستور ہے"۔

مسکرائے ۔ وہی مسکراہٹ "آج تمہارے منہ سے کس قدر صحیح جملہ نکل گیا"۔

میں نے کہا :- "پروفیسر صاحب اُس دن آپ کا برتاؤ جمال کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔"
"میرا برتاؤ ؟" انھیں بڑا تعجب ہوا گویا ان کے خیال میں تمام باتوں کا ذمہ دار میں ہی تھا، ان کی آنکھوں میں چمک اور زیادہ بڑھ گئی۔ کہنے لگے "انسان اگر پہلے ہی سے کوئی توقع نہ قایم کرے تو بدگمانی اور بداخلاقی کا وجود ہی مٹ جائے۔"
میں نے کہا :- "تو دُنیا کا کام کیسے چلے ؟"
"نہ چلے !" نہایت فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور ان کے شکن آلود ماتھے پر ایک شکن کا اور اضافہ ہوگیا۔
"جمال کی زندگی سے آپ واقف نہیں اس کی شاعری اور اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔" میں نے پھر چھیڑا۔
"تو بیوقوف ہے !" یہ کہکر وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئے۔ میں بھی گھر چلا آیا، میں نے اپنے ضمیر کو بہت بُرا بھلا کہا۔ بہتیرا احساس خودداری دلایا مگر پروفیسر صاحب کی شخصیت کے سامنے ایک نہ پیش گئی۔ اب میں یہاں زیادہ جانے لگا۔ کبھی کبھی کچھ اشعار سنا ہی دیتا۔ بعض اوقات، وہ بے حس بیٹھے رہتے، بعض دفعہ گھبراکر چلے جاتے مگر میں باز نہ آتا اور جمال کے اشعار انھیں سُنا دیا کرتا۔ آخر وہ دن بھی آہی پہونچا جب انھوں نے نہایت نرم مگر مستحکم لہجہ میں کہدیا کہ "آج سے میں نے عزم کرلیا ہے کہ کسی سے نہ ملوں گا۔"
پروفیسر صاحب کے عزم کے معنی میں جانتا تھا، وہ کہا کرتے تھے "موت اور میرا عزم یہ دو چیزیں کبھی نہیں ٹل سکتیں" اب تک وہ میری جسارت کو برداشت کرتے رہے، مجھے تو یہی خوشی تھی، ورنہ میری جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو نہ معلوم کیا کر بیٹھتے۔ بہرحال مجھے رنج ضرور ہوا، اور میں نے ارادہ کرلیا کہ اب میں کبھی نہ جاؤں گا۔ ادھر خوش قسمتی سے میرا تبادلہ بھی دوسری جگہ ہوگیا، رفتہ رفتہ پروفیسر صاحب ذہن سے اُترتے چلے گئے۔ ہاں جمال سے البتہ تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ وہ میرے یہاں کبھی کبھی آبھی جاتا تھا۔ جمال میں اِدھر ایک بین تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اب افسردہ رہا کرتا۔ اس کی گفتگو اور لہجہ سے شگفتگی زایل ہو چلی تھی مگر اشعار میں درد اور بڑھ گیا تھا۔ میں اس تغیر کی وجہ بخوبی جانتا تھا، کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل قریب ہوگئے تھے
تین سال کے بعد مجھے ایک کام سے پھر وہیں جانا پڑا۔ ریل میں سوار ہوتے ہی مجھے پہلی بار پروفیسر صاحب کی یاد آئی — گاڑی جتنی قریب ہوتی گئی، جمال سے زیادہ پروفیسر صاحب میرے دل و دماغ پر چھاتے گئے۔ میں نے عجیب بےچینی اور کشمکش سی محسوس کی۔ گاڑی سے اُترنے کے ساتھ ہی میں سیدھے ان کے بنگلہ پر پہونچا مگر وہاں وہ نہ ملے — بنگلہ خالی تھا میرا دل دھک سے ہوگیا دُنیا اپنی جگہ سے ہل جائے مگر پروفیسر صاحب جنبش کرنے والے نہیں تھے — دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں، تلاش کرنے پر ان کا مکان ملا، مکان دیکھتے ہی ایک نامعلوم خوف جس میں کچھ غم بھی شامل تھا میرے تمام بدن میں سرایت کرگیا۔ مکان نہایت چھوٹا اور تاریک تھا۔ میں اندر گیا۔ تین کمرے تھے۔ جس میں سے صرف ایک میں روشنی تھی۔ "باورچی کہاں گیا ؟" میں نے دل میں سوچا اور پھر نہ معلوم کیوں اپنے خیال پر خود ہی پریشان سا ہوگیا۔ میں کمرہ کے سامنے پہونچا۔ پروفیسر صاحب کُرسی پر پاؤں پھیلائے حسب دستور لیٹے ہوئے تھے اور سگریٹ کا دھواں کمرہ میں چکر کھا رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑے۔ شاید مدت سے وہ انسانی قدموں کی چاپ سے ناآشنا تھے — مجھے دیکھا۔ میں ان کی آنکھوں کا سامنا نہ کرسکا۔ ایک عجیب مُسکراہٹ، جس میں پہلی بار بیچارگی کا عکس تھا، ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ بولے :- "کہئے آپ کی دُنیا کا کیا حال ہے ؟"
میں ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ اچھی طرح دکھائی پڑ رہا تھا۔ شدت، تاثر اور ہجوم خیالات سے میں ان کے سوال کا جواب دینا یا کچھ اور کہنا بھول گیا۔ ان کے خشک چہرہ پر جھریاں زیادہ پڑ گئی تھیں۔ سر کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ آنکھوں میں چمک ضرور تھی مگر بجھتے ہوئے چراغ کی سی۔ کمرہ بالکل خالی تھا معلوم ہوتا تھا

کہ اسباب اور فرنیچر بہت کم ہوگیا ہے۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی آخر میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"کہئے کیسے ہیں؟"

میرے اس سوال سے غالباً انھیں اذیت ہوئی کہنے لگے :۔ "اس سوال کو آپ میرے سوا دُنیا میں سب سے پوچھ سکتے ہیں اور میرے سوا غالباً ہر شخص اس کا جواب دے سکتا ہے۔"

میں پھر چُپ ہوگیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"جمال کے کچھ شعر سناؤں"

میں نے سنانا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب اسی محویت کے عالم میں بیٹھے رہے جس طرح پہلے بیٹھا کرتے تھے۔

میں نے پوچھا :۔ "پسند آئے؟"

"وہ زندہ ہے ابھی تک؟"۔ یہ سوال انھوں نے کسی دوسرے کے بارے میں اب تک شاید نہ پوچھا تھا!۔

"محبت؟" انھوں نے طنزیہ لہجہ میں دہرایا اور پھر خلاف معمول خوب ہنسے۔ اتنا ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے

(جمال واقعی اب زندہ نہ تھا)

میں اُٹھ کر گھر چلا آیا۔

نایاب کتابیں

تاریخ و تذکرہ

تذکرہ علماء ہند --- رحمان علی ---- مغہ
تذکرہ ہندی ---- مصحفی ---- لہ عہ
تذکرہ نکات الشعراء --- میر تقی میر ---- سے
تذکرہ ریاض الفصحاء --- مصحفی ---- مے
تذکرہ عقد ثریا ---- مصحفی ---- للعہ
تذکرہ شعرائے اُردو --- میر حسن دہلوی ---- مغہ
تذکرہ رکھتی گویان --- فتح علی ---- للعہ
تذکرہ گلزار ابراہیم و گلشنِ ہند --- لطف علی --- عہ
تذکرہ شعرالہند - ۲ حصے --- عبدالسلام --- ۳۷ سے
منتخب التواریخ --- عبدالقادر بدایونی ---- ضہ
تاریخ وقائع راجستان - ۲ حصے - نجم الغنی ---- نہ
دبستان المذاہب --- مرزا محسن ---- عہ
امرائے ہنود --- محمد سعید ---- عہ

دواوین فارسی، اُردو

دیوان محتشم کاشانی (جلالیہ) ---- ۳۰
دیوان ظہوری --- نورالدین ظہوری ---- عہ
دیوان صائب --- محمد علی صائب ---- سے
دیوان غنی --- محمد ظاہر غنی کشمیری ---- سے
طیبات شیخ سعدی - غزلیات و قصاید ---- سے
آفتاب داغ --- نواب مرزا داغ ---- للعہ
دفتر فصاحت --- خواجہ وزیر ---- مے
دیوان شوق --- احمد علی شوق ---- عہ
دیوان شرف --- آغا ہجو شرف شاگرد آتش ---- عہ
دیوان نظیر اکبر آبادی - مرتبہ بلاقیداس ۱۸۸۰ء --- سے
کلیات آتش --- حیدر علی ---- عہ
کلیات سودا مع مقدمہ سوانح عمری، مرتبہ عبدالباری آسی --- نہ
کلیات مومن خاں --- مومن خاں ---- عہ

چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

شذرات

(نیاز فتحپوری)

انشاء و جرأت "ہر وہ بات جو مشہور ہو جائے صحیح نہیں ہوتی" _____ اور ہماری انفرادی غلطیوں کا اجتماعی صورت اختیار کر لینا اس میں شک نہیں بڑی افسوسناک بات ہے، آج خدا جانے کتنے مقدس مزار ایسے ہیں جن میں آج تک کوئی دفن ہی نہیں کیا گیا اور تاریخ کی کتنی مشہور ہستیاں ایسی ہیں جو کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھیں۔ پھر اگر شاعری کی دنیا میں بھی یہ اندھیر نظر آئے، تو حیرت کی کیا بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جرأت پر صرف بازاری شاعر ہونے کا الزام یقیناً غلط ہے اور اس کے ثبوت میں جس قسم کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں اُن سے زیادہ عریاں میر کے یہاں بھی ہیں، مگر میر کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس بدنامی کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب درباداری کے سلسلہ میں انشاء و جرأت کے دو اکھاڑے لکھنؤ میں قایم ہو گئے تھے اور ہر فریق دوسرے کو ذلیل کرنے کے لئے گندگی اُچھال رہا تھا۔ اسی مسخرہ پن نے انشاء کو اس کے اصلی مرتبہ تک پہونچنے سے روکا اور جرأت کو بدنام کیا، لوگ جرأت و انشاء کا مقابلہ کرنے میں انشاء کو ترجیح دیتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہجو و طنز کے لحاظ سے یہ فیصلہ صحیح ہو، لیکن غزل گوئی کے لحاظ سے اُس کو جرأت سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اول تو انشاء کا سرمایۂ تغزل بہت ہی کم ہے اور جو ہے بھی اس میں بہت کم اشعار قابل انتخاب نظر آتے ہیں۔ برخلاف اس کے جرأت کے دواوین کی تعداد نو بتائی جاتی ہے اور ان میں اتنے اچھے اشعار پائے جاتے ہیں کہ سخت انتخاب کے بعد بھی دیوان انشاء سے کئی گنا زیادہ اس کا حجم ہوتا ہے۔

صحیح ہے کہ جرأت کے یہاں شوخی و عریانی بھی پائی جاتی ہے اور انھوں نے معاملات حسن و عشق کے بیان میں ادنیٰ قسم کے شہوانی و جنسی جذبات سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن یہ غالباً جرأت کا اصلی رنگ نہ تھا اور صرف اُس عارضی ماحول کا نتیجہ تھا جو لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں پیدا ہو گیا تھا۔

اگر اس کے دواوین سے تمام وہ اشعار جنھیں عریاں کہا جا سکتا ہے چھانٹ لئے جائیں تو زیادہ سے زیادہ سو دو سو ہوں گے _____ برخلاف اس کے دوسرے رنگ کے اشعار جن میں میر کا سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے بہت زیادہ تعداد میں نظر آئیں گے۔

حیرت کی بات ہے کہ جرأت کے ان اشعار کا ذکر تو ہر جگہ ہے:-

دیکھوں تو یوں وہ کہکے لگے منھ کو ڈھانپنے، کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا، چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

لیکن ان شعروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا:-

ترے بن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہو گئی غم سے کہ اپنے سے تو اُس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا

کیا طبیعت ہے اُداس اب سچ ہے اے جرأت یہ بات جی کہیں لگتا نہیں جب دل کہیں لگ جائے ہے

اب تو ہر ہر بات پر آزردگی آنے لگی، میری بیتابی جو اُس بیدرد کو بھانے لگی
یہ نہ کہہ یاد آئی کس کی، جو کلیجہ پر مرے سانس کے لینے میں اک برچھی سی لگ جانے لگی

ناصحا اس کو چھوڑ دیں کیونکر جس کو پایا ہے جان کھو کھو کے

کل جو بیٹھا پاس میں یکجا ترے ہمنام کے رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے

نہ کوئی ہے دوست، نہ مہرباں، نہ شفیق ہے نہ رفیق یاں کریں کس سے ہم غم دل بیاں جو سخن کے تھے شنوا، گئے
مجھے جرأت اب نہیں کچھ خبر گئے عقل و ہوش و خرد کدھر یہ مرے پیامبر آن کر مجھے کیا پیام سنا گئے

جب تلک کرتے رہے مذکور اس کا مجھ سے لوگ جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

قفس میں ہمصفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا
کیا اس عشق کی وحشت نے کیا دیوانہ جرأت کو عجب احوال ہم دیکھا ہے کل اس خانہ ویراں کا

واں سے آیا ہے جواب خط، کوئی سنیو ذرا میں نہیں ہوں آپ میں مجھ سے نہ سمجھا جائے گا
شکر تم آ گئے گھر اس کے، نہیں جرأت کے سر اُٹھا کر ابھی دیوار سے مارا ہوتا،

آج اُس کوچہ میں کیا جا کے تو سُن آیا ہے جرأت ایسا تو کبھی آگے تو خاموش نہ تھا
آج کی رات کٹے دیکھئے کس شکل سے آہ اس نے پھر وعدۂ دیدار سحر پر رکھا

ناصحو آپ میں جرأت نہ رہا اب سمجھ کر اسے سمجھائیے گا

اپنے پہلو سے وہ جب اُٹھ کے چلا اے جرأت اس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم
ہے وقت خوش انھوں کا کیا لطف ہمدگر ہیں دل جن کے مل رہے ہیں اور پاس پاس گھر ہیں

جرأت کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میر کے رنگ کا دلدادہ تھا اور اسی رنگ میں شعر کہنا کمال تغزل جانتا تھا، چنانچہ ایک غزل میں کہتا ہے :-

جرأت، جواب میر تو ایسا ہی کہ کہ اب چاروں طرف سے شور سنے واہ واہ کا

اور پھر اسی زمین میں دوسری غزل کہکر اسے یوں ختم کرتا ہے :-

آوارہ در بدر ہوں میں جرأت، بقول میر "خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا"

اسی سلسلہ میں آپ اس کے اُستاد حسرت کو بھی دیکھئے کہ اس غریب کو بھی لوگوں نے پس پشت ڈال دیا ہے اس کے بھی شاید دو دیوان تھے لیکن اب وہ بھی نہیں ملتے۔

ذکر آ گیا ہے تو چند اشعار بھی سُن لیجئے :-

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا،

اسی زمین کا ایک شعر سنئے، کیا قیامت ہے :-

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

اے دل اگر تڑپنا تیرا یہی رہے گا کاہے کو تو جئے گا، کاہے کو جی رہے گا
رہنے دے مے کو ساقی ہم تو چلے یہاں سے قسمت میں جس کے ہوگا سو جام پی رہے گا

بھولتا ہی نہیں وہ، دل سے اُسے ہم نے سو سو طرح بھلا دیکھا،
ٹپکنے دے مجھے سر اُس کے آستانے سے خبر کر دوں ہوں میں اپنی اسی بہانے سے

سراغ پوچھوں میں کیا اشک آہ کا دل سے — کہ اس دیار سے ہو کتنے قافلے نکلے،
جگر کے زخموں کو جانے تھا بھر چلے حسرت — خراش ناخن غم سے وہ سب چھلے نکلے

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم
تیرا تو تب اعتبار کیجے — جب ہوئے کچھ اعتبار اپنا

ہر چند یہ زمانہ اب غزلوں پر سر دھننے کا نہیں ہے، لیکن ہم آپ اس زمانہ کے ہیں کب؟ ہم آپ تو جب مل بیٹھیں گے ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کریں گے، اوروں کے لئے نہیں، اپنے لئے۔ جب کوئی غیر اس صحبت میں آجائے گا تو اُس وقت دیکھا جائے گا، سنبھل بیٹھیں گے۔ ایک لطیفہ یاد آگیا سن لیجئے، "دو سرپھرے آپس میں بیٹھے ہوئے نہایت مزے کی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے کہ ایک تیسرا شخص اور آتا ہوئے دکھائی دیا، جو ان کے ذوق و صحبت کا نہ تھا اور اپنے کو بڑا فلسفی سمجھتا تھا، انھوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور بولے کہ "یار آؤ اب سمجھ کی باتیں کریں وہ دیکھو ایک بیوقوف آرہا ہے"۔

ترقی پسند لٹریچر ادب و آرٹ میں واقعیت کا مطالبہ کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن Realism یا واقعیت کا مفہوم البتہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ تھا جب حقیقت نام تھا صرف اعتقاد کا اور بڑے سے بڑے جھوٹ کو واقعہ کہکر پیش کیا جاتا تھا۔ یا ایک زمانہ یہ ہے کہ حقیقت کے متعین کرنے میں ہم بسا اوقات اخلاقی بیرحمی اور ذہنی گندگی سے بھی گریز نہیں کرتا۔

دُنیا میں اس سے پہلے بھی آزاد طبیعتوں نے کبھی کبھی "سوسائٹی" سے بے نیاز ہو کر اس کا مفہوم متعین کیا تھا اور اب کہ سماج و مذہب کی بھی بعض بندشوں کے خلاف زیادہ شدید ردِ عمل شروع ہو چکا ہے، اس بے نیازی کو قدرتاً اور زیادہ بیباک صورت اختیار کرنا ہی چاہئے۔

"ترقی پسند لٹریچر" کے حامی "ادب برائے ادب" کے قایل نہیں ہیں بلکہ "ادب برائے حیات" کے مدعی ہیں اور اُصولاً یہ بات بُری نہیں ہے، لیکن عملاً ہمارے بعض ادیب حیات کا مفہوم ہی غلط سمجھتے ہیں اور اس لئے ان کے ادب میں غلطیوں یا نامناسب جسارتوں کا پایا جانا قدرتی بات ہے۔

یقیناً یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ ادب اور زندگی کے سوال کے ساتھ ہی، عورت کا خیال دل میں کیوں آئے اور اگر آئے بھی تو اس طرح کیوں کہ ہم اس کی عزت کرنے کی جگہ اس سے کھیلنے لگیں۔ اس مسئلہ پر میں نے جہاں تک غور کیا ہے، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آزادی اور اشتراکیت جو اس زمانہ کی پیداوار ہیں، دونوں ابھی تک کھلونا بنی ہوئی ہیں اور ابھی تک ہم نے اُن کی صحیح راہ متعین نہیں کی۔

آج کل کے نوجوانوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری موجودہ اقتصادی و سیاسی مشکلات بے لاگ تنقید اور سوسائٹی کے فرق مراتب توڑنے کے بعد ہی دور ہو سکتی ہیں اور ایک حد تک یہ خیال غلط نہیں ہے، لیکن بے لاگ تنقید نام نہ بدتمیزی کا ہے اور نہ فرق مراتب توڑ کر قومی کلچر کو فنا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ خود روس میں جہاں کی تحریک اشتراکیت نے ہندوستان کے نوجوانوں میں ولولۂ انقلاب و آزادی پیدا کیا ہے، نہ لٹریچر میں وہ گھنونا پن پایا جاتا ہے جو ہمارے یہاں کے بعض نوجوان ادیبوں کے لئے باعث فخر ہے، اور نہ سوسائٹی میں "فرق مراتب" کے حدود کو توڑا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ روس میں ایک مزدور و انجنیر دونوں کی معاشرت یکساں ہے یا یہ کہ وہاں کی جنسی زندگی ادارۂ فحاشی سے زیادہ نہیں۔ حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

آزادی کا جذبہ اس میں شک نہیں بڑا اچھا جذبہ ہے، لیکن تہذیب و اخلاق کی حدود سے گزر جانے کا نام آزادی نہیں۔

آج کل نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ مرض عام طور پر پھیلا ہوا ہے اور ان کے یہاں آزادی نام ہے صرف دریدہ دہنی اور گندگی اُچھالنے کا - ایک بار میں نے یونیورسٹی کے جلسہ میں دیکھا کہ طلبہ نہایت بدتمیزی سے ہر ہر شخص مضحکہ اُڑا رہے تھے اور پروفیسروں اور عورتوں پر بھی کھلم کھلا آوازے کس رہے تھے اگر آزادی اور بے لاگ تنقید اسی کا نام ہے اور یہی چیز ہمارے لٹریچر میں بھی پیدا ہوتی رہی تو یقیناً یہ انقلابی دور انسان کی آیندہ نسلوں کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوگا - لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب موجودہ ہیجان میں کمی ہوگی تو یہ خس وخاشاک از خود دور ہو جائیں گے اور زیادہ سنجیدہ فضا ہمارے سامنے ہوگی -

یہ بالکل صحیح ہے کہ جنسی مسایل پر اس وقت کے بعض ادیب (جن میں بدقسمتی سے دو چار عورتیں بھی شامل ہیں) نہایت بدتمیزی کے ساتھ اظہار خیال کر رہے ہیں اور ان کی تحریروں میں غلاظت وگندگی کا عنصر غالب ہے، لیکن آپ اس قسم کے لٹریچر کو "ترقی پسند لٹریچر" کیوں سمجھیں اور اس رنگ کے لکھنے والوں کو "ترقی پسند ادب" کا صحیح نمایندہ کیوں قرار دیں -

ان کے علاوہ اور بہت سے لکھنے والے ایسے ہیں جو وقت کی ضرورت کا ساتھ دے رہے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں پوری سنجیدگی ومتانت کے ساتھ لکھتے ہیں، آپ ان کا مطالعہ کیجئے اور اُن کو نظرانداز کیجئے - پانی کی سطح پر خس وخاشاک دیکھ کر تمام پانی کو گندہ سمجھ لینا مناسب نہیں -

دبی دبائی آگ

شکایت نامہ کا اتنا پیارا جواب! گلۂ محبت پر یہ شرم وحجاب! قیامت ہے قیامت!

تغافل کے گلے سُن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

میں آپ کی مجبوریوں سے واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ بغیر قصد وارادہ کے آپ کس قدر خوبی کے ساتھ لوگوں کا دل دُکھا سکتی ہیں، پھر آپ وہ عذر کیوں پیش کریں، جو باوجود صحیح ہونے کے، درد دل کا مداوا نہیں ہو سکتا -

آپ یہاں سے دہلی تشریف لے گئیں اور مجھے کوئی اطلاع نہیں دی، وہاں سے علی گڑھ آئیں اور مجھے بے خبر رکھا گیا، پھر مرادآباد، دیرہ دون اور خدا جانے کہاں کہاں پہونچیں، اور مجھ کو کوئی علم نہیں، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی اور اب آپ کو ہوش آیا کہ کوئی "نامراد نہ زلیست کرنے والا" لکھنؤ میں بھی رہتا ہے!

میں نے عرض کیا کہ "ذرا تفصیل سے کام لیجئے"۔ آپ نے اس کے جواب میں صرف ایک "آہِ سرد" سے کام لیا اور خاموش ہو رہیں - یوں تو بظاہر اس تمام داستان میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو دُنیا کے لئے عجیب وغریب ہوتی، لیکن میرے لئے - اب کیا بتاؤں — یہ کیا تھا

ہزار دھیاں کوٹا لا خیال آ ہی گیا

آپ کو تو شاید یاد نہ ہوگا، لیکن میں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا، جب آپ، میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک پھول سے کھیل رہی تھیں اور میں خوش تھا کہ - آج میں نے اپنا دل — "خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا" — پھر کیا ہوا - اس کا مجھے بھی ہوش نہیں -

بہرحال، اب کہ شوق واجتناب کی تمام منزلیں ختم ہو کر، ہم آپ دونوں پھر اجنبی ہو چکے ہیں، زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں

یہ سب درست کہ تم بُت بھی ہو خدا بھی ہو
مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو!

میں ۳ر اور ۴ر فروری کو رام پور میں تھا - آپ کا خط واپسی پر ملا - پہلے مل جاتا، تو شاید آپ سے قریب تر ہونے کا احساس مجھے حاضری پر مجبور کر دیتا، لیکن اب ممکن نہیں — خدا حافظ

ہنا چلا ڈھیر راکھ کا میں، بجھا چلا اپنے دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ لے کا رواں رہیگی

کسٹم
اور
مرکزی آبکاری
کے محکموں میں

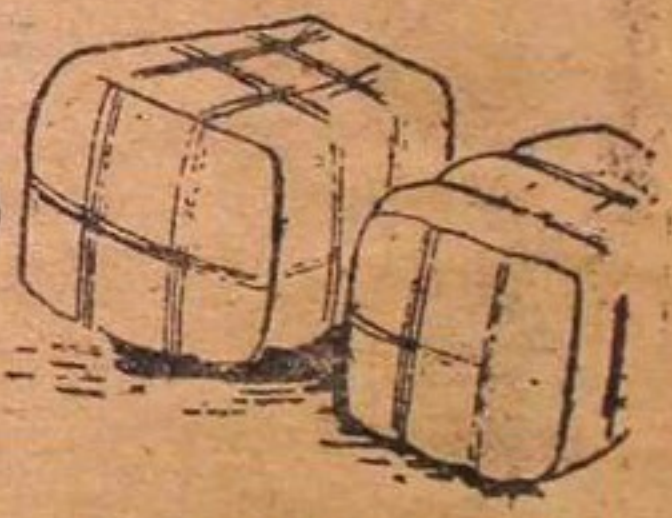

میٹرک نظام

ناپ و تول کا میٹرک نظام اکتوبر ۱۹۶۰ء سے کسٹم اور مرکزی آبکاری کے محکموں میں لاگو ہو گیا ہے اور محصولات کی شرحیں میٹرک یونٹوں میں ظاہر کی جا چکی ہیں
موجودہ شرحوں کو ممکن حد تک، قریب ترین میٹرک یونٹوں میں بدلا جا چکا ہے

میٹرک نظام
آسانی و یکسانی کے لئے
جاری کردہ بھارت سرکار

DA 49/330

دوست بنانے
اور
دوستی بڑھانے کے لیے
ہمیشہ استعمال کیجیے

گولڈ کوائن
اصلی
ایپل جوس
صاف و شفاف

بنانے والے

ڈائرمیکن بروریز لمیٹڈ

قائم شدہ سنہ ۱۹۵۵ء لکھنؤ

ڈیکٹریز :- سولن بروری - لکھنؤ ڈسٹلری - کسولی ڈسٹلری
موہن نگر بروری اینڈ لائیڈ انڈسٹریز (یوپی)

تضمین کلام غالب

(مائی - جائسی)

حضرت مائی جائسی، ہمارے کلاسکل شعراء کی صف میں (جواب بہت مختصر رہ گئی ہے) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ صحیح سوچنے والے تو بہت ہیں لیکن صحیح کہنے والے کم، لیکن جناب مائی فکر و بیان دونوں حیثیتوں سے قدر اول کے شاعر ہیں اور خصوصیت کے ساتھ "کلام غالب کی تضمین" تو انکی جاگیر ہے جس میں کوئی اور انکا سہیم و شریک نہیں۔ (نیاز)

خود اپنی زندگی کو پریشاں کئے ہوئے — آنکھوں کو انتظار میں درباں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں کب سے جشن کا ساماں کئے ہوئے — مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ٹھکرا دیا ہے مرتبۂ تاج و تخت کو — طے کر رہا ہوں منزلِ دشوار و سخت کو
رہبر بنا لیا ہے دلِ نیک بخت کو — کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

یوں تو ہمیشہ جان رہی موردِ ستم — لیکن جنوں میں کچھ غمِ دل ہو گیا تھا کم
پھر ہوش آکے دینے لگا درسِ ضبطِ غم — پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر ظلمتِ فراق سے بیزار ہے نفس — پھر اضطرابِ غم میں گرفتار ہے نفس
پھر سوزِ دل سے صاعقہ کردار ہے نفس — پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

نیرنگیوں میں رنگِ جہاں سے سوا ہے عشق — غم کی دوا ہے اور غمِ لادوا ہے عشق
پھر ایک طرزِ خاص میں شورش فزا ہے عشق — پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

اب پھر ہے فاش ہونے کو رازِ درونِ دل — پھر ہے فسانہ بننے کو میرا فسونِ دل
تا چند ضبطِ گریۂ بحالِ جنونِ دل — پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

اللہ رے اشتیاقِ جمالِ رخِ حبیب — جب سے ہوئی ہے دورِ قمی جاناں مجھے نصیب
پھر پیش آگیا ہے وہی مرحلہ عجیب — باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ وخیال کا ساماں کئے ہوئے

خودداریوں کو بے خودیِ دل مٹائے ہے — جوشِ جنوں وقارِ خرد کے بجائے ہے
پھر آج تمکنت پہ مری حرف آئے ہے — دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

راہِ وفا میں پھر ہے مجھے یار کی طلب آنکھیں ہیں اور حسن کے دیدار کی طلب
پھر دل ہے اور لذت آزار کی طلب پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہجرِ چمن میں رہتا تھا ہر چند جی نڈھال ہو جاتا تھا تصورِ گلشن سے کچھ بحال
اب ذوقِ رنگ و بو کا ہو کیا جانے کیا مآل دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر اشکِ انبساط کے موتی ہیں رولنا پھر میں ہوں اور تابِ تحمل کا تولنا
پھر چپ سی لگ گئی ہے نہ ہنسنا نہ بولنا پھر چاہتا ہوں نامۂ دیدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کئے ہوئے

قسمت سے بزمِ ناز میں پایا تھا دو ترس، نظارۂ جمال میں گزرے تھے کچھ نفس
اب آرزو ہے پھر اسی جلوے کی اور بس مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کب تک پھرا کرے کوئی دنیا میں سو بہ سو جی میں ہے پھر بڑھایئے مقتل کی آبرو
یعنی پھر اس نگاہ سے ہو دل کی گفتگو چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک لمحہ شوقِ دید کو جلوے نے دی پناہ پھر آج تک نگاہوں میں دنیا رہی سیاہ
اب پھر نہیں نظر کے لئے کوئی سدِ راہ اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے فروزاں کئے ہوئے

پھر دل سے محو ہو گئی روداد اشک و آہ پھر حسنِ جاں ستاں سے بڑھاتا ہوں رسم و راہ
شاید یہی شگوفہ کرے گا مجھے تباہ اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

دل غم سے ڈوب جائے کہ اشک آنکھ سے بہیں تقدیر ہی یہ ہے کہ جو پیش آئے وہ سہیں
دکھ کس کے آگے روئیں کہاں حالِ دل کہیں پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

گزری ہے عمر وادیِ الفت میں یار بن رخصت ہوا شباب نہ وہ ولولہ نہ سن
ہم پھر بھی ہیں نہ فکر سے فارغ نہ مطمئن جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

مانی کی طرح لاکھ ستم عشق میں سہے کتنے ہی رات دن ہمیں روتے گزر گئے
پھر آج ضبطِ اشک کے پیاسے ہیں حوصلے غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ گریہ سے
بیٹھے ہیں ہم تصورِ جاناں کئے ہوئے

(جگر بریلوی)

یہ ابر و باد کا موسم، بہار گل کا یہ جوش — کبھی تو ساغر اُٹھانے دے اے دلِ غمکوش
نکال لیتا ہے راحت میں رنج کے پہلو — تمہارے لطف سے بھی خوش نہیں دلِ غمکوش
وہ وحشتیں ہوں کہ دانائیاں غنیمت ہیں — جو بند ہو گئیں آنکھیں تو پھر جنوں ہے نہ ہوش
جنونِ وہم و خرد سے بلا نہ آہ، فراغ، — یہی رہی ہمیں حسرت کبھی تو آتا ہوش
تمام حشر ہوا لیکن اس سے کیا حاصل — تڑپ رہا ہے ابھی تک دلِ محبت کوش

گزر گیا حدِ ادراک سے جگر آگے
یہ وہ مقام ہے جس جا نہ بیخودی ہے نہ ہوش

اُداسیاں سحر و شام کی نہیں اچھی — جگر یہ خو دلِ ناکام کی نہیں اچھی
کہیں یہ پھولوں کے ایما سے ہوں نہ مرغ اسیر — شکایتیں قفس و دام کی نہیں اچھی

(گوہر - مہوچھاؤنی)

اے غمِ یار تیری عمر دراز — اب ہر اک غم سے رشتہ داری ہے
اک نگاہِ عتاب کا کیا ذکر، — آپ کی ہر نگاہ پیاری ہے
چاند کی نرم نرم کرنوں سے — آبشارِ شراب جاری ہے

تمہارے قدموں کی ہے یہ آہٹ کہ چاندنی گنگنا رہی ہے — دماغ میں پھول کھل رہے ہیں، خیال کو نیند آ رہی ہے
حقیقتوں کو فسانہ لیکن کوئی بنائے کہاں تک آخر — حیات کی تلخیوں کے سائے میں ہر خوشی تھرتھرا رہی ہے

بغیر تیرے گزر رہا ہے نہ پوچھ اے جانِ دوست کیونکر — یہ رقصِ جام و سبو کا موسم، یہ نغمہ و شعر کا زمانہ

(شفا گوالیاری)

ہونے کو یوں شام بھی ہوتی ہے، سحر بھی
لیکن کسی صورت سے ہو تسکین نظر بھی!

جاتا ہوں سنانے میں وہاں غم کی کہانی
ہو جاتے ہیں ناکام جہاں دیدۂ تر بھی!

میں اپنی تباہی پہ ذرا غور تو کر لوں،
کیا ظلم ہے اے گردشِ ایام ٹھہر بھی!

اللہ رے آشفتگیٔ دورِ اسیری
جب آئے رہا ہو کے رہا یاد نہ گھر بھی!

(اکرم دھولیوی)

نہ چمن کا رنگ بدلا نہ مزاج باغباں کا
ہے روش روش ابھی تک گل و خار کا فسانہ

سرِ انجمن مقابل کبھی تم رہے کبھی دل
مجھے شکوۂ ستم کا نہ ملا کوئی بہانہ

(سعادت نظیر)

طراوت، اللہ، اللہ! خار و خس میں!
نویدِ موسمِ گل! اور قفس میں!

اسیری اور پھر ایسی اسیری!
نہ آئے نکہتِ گل تک قفس میں!

نئے بھارت کے معمار

تعلیم تعمیر ترقی

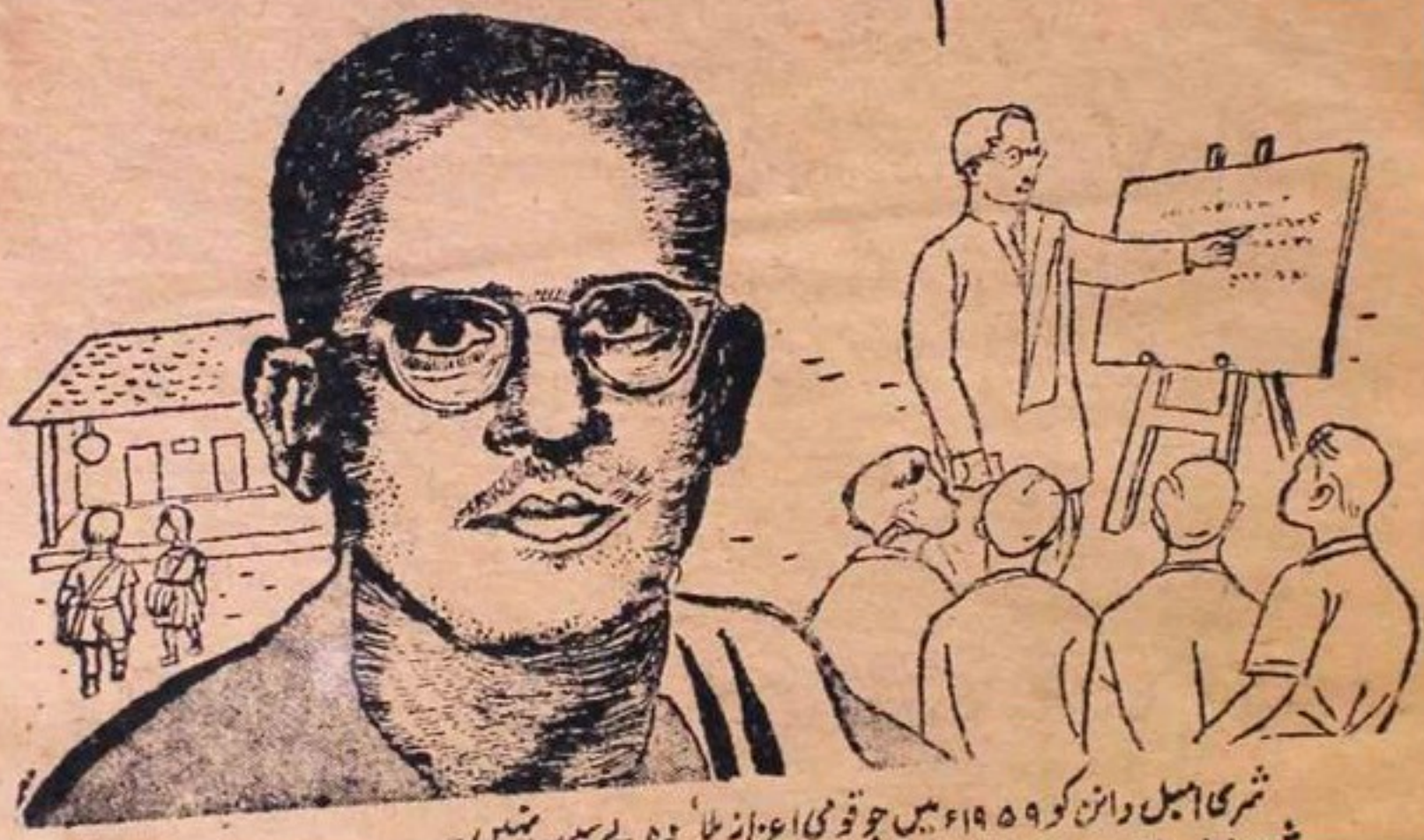

شری امبل وانن کو ۱۹۵۹ء میں جو قومی اعزاز ملا، وہ بے سبب نہیں۔
شری امبل وانن ریاست مدراس میں واقع ضلع جنوبی آرکاٹ کے قصبہ ورکل پٹی میں بورڈ ہیگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور پچھلے تیس برس سے تعلیم کو فروغ دے کر ملک کی تعمیر و ترقی میں تعاون بن رہے ہیں۔ اُن کی لگن سچی ہے۔ کامیابی نے اُن کے قدم چومے۔ انہیں کی مبارک کوششوں کے نتیجے میں ضلع کے کتنے ہی اسکول اب توسیع پا چکے ہیں۔ پہلے جہاں اُن میں ایک ایک اُستاد پڑھاتا تھا، اب وہاں متعدد اُستاد تعلیم دیتے ہیں۔ یہی نہیں، اس نیک کام میں انہیں گاؤں والوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔
شری امبل وانن بڑے ان تھک کارکن ہیں۔ اُنھوں نے اپنے اسکول میں بچوں کے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔ ان کی اعلیٰ اور گراں قدر خدمات کی جتنی سراہا جائے کم ہے۔
شری امبل وانن جیسے سرگرم کارکن ملک کی افزوں ترقی کے لئے میدان ہموار کرتے ہوئے نئے بھارت کی تعمیر میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

پلان سے مضبوطی
پلان سے خوشحالی
پلان کو کامیاب بنائیے، محنت سے بچت سے

پورا پتہ۔
پتہ صاف
ڈاک تیز
رسانی

آپ کے خط کا پتہ ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور جب آپ اپنی تحریر کے اس حصے میں اختصار سے کام لیتے ہیں تو ہمیں سخت چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ پتہ نامکمل ہو تو خط پہونچانے کے لئے بڑی تلاش سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں خط پہونچانے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

آپ کے خط یقیناً
پتہ مکمل اور صاف صاف لکھئے۔
جلدی پہونچیں گے۔

ہمیں بہتر خدمت کا موقع دیجئے

محکمۂ ڈاک و تار